افکار



The

MONTHLY

AFKAR

BHOPAL

جلد ۸
شمارہ ۵۴ و ۵۵

جنوری ۱۹۴۹ء

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا (اقبال)

سُرخیاں

ماہنامہ **افکار** بھوپال

زرِ سالانہ چھ روپے — فی پرچہ آٹھ آنے

:نگراں:
حکیم سید قمر الحسن

:ادارہ:
اشتری - صہبا

افـــــــــــکار

کا

پہلا خاص نمبر

دنیائے ادب میں چکا چوند پیدا کرچکا ہے

اب

دوسرے خاص نمبر کا انتظار کیجئے

جس کی تیاریاں شروع کردی گئی ہیں

افکار— کے خاص نمبر کو اردو زبان وادب کے اس بحرانی دور میں

سنگ میل کا درجہ حاصل ہوگا—

(مشتہرین کیلئے نادر موقع)

تفصیلات کیلئے—

منیجر افکار بھوپال

اشاریہ

لسانی قضیہ

ان دنوں لسانی قضیہ پوری طرح نقطۂ عروج پر پہونچ گیا ہے اور سارے ملک میں سیاسی گھما گھمی کی وجہ سے زبان اور رسم خط کے تانے بانے بھی نت نئے رشتوں میں جوڑے جا رہے ہیں اور بعض غلط فہمیوں کی بناء پر زبان کے مسئلہ میں تعصب اور فرقہ واریت کا رنگ دیکر ہندی اردو کے حامیوں کے درمیان الزامات اور جوابی الزامات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ یہ معاملہ جتنا سیدھا سادا اور عام فہم ہے اسی قدر اس میں الجھنیں اور پیچیدگیاں بڑھائی جا رہی ہیں اور تعمیری پہلو کو نظرانداز کر کے خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنایا جا رہا ہے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ملک میں صرف وہی زبان قائم رہ سکتی ہے جو وقت کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ اور عوام اسے اپنانے کے لئے بیتاب ہوں۔ مصنوعی زبان ملک کے سر تھوپنا قومی روایات اور کلچر کے سخت خلاف ہے۔ کانگرس کے جے پور اجلاس میں پنڈت نہرو نے لسانی ہسٹریا میں مبتلا ہونیوالوں سے صاف صاف کہدیا ہے کہ ہندی ہندی چیخنے والوں کو وقت آنے پر مناسب جواب دیا جائیگا۔ صدر کانگرس ڈاکٹر پٹابھی سیتارمیہ نے اپنے خطبہ میں واضح کر دیا ہے کہ ہندی صرف یو۔پی ہی کی زبان بن سکتی ہے، اسے تمام ہندوستان پر عائد نہیں کیا جا سکتا۔ ملکی زبان سنسکرتی ہندی اور عربی فارسی ملی اُردو کے بین بین ہے۔ جو ملک میں بولی اور سمجھی جا رہی ہے ——

کاش وہ لوگ جو زبان کے مسئلہ کو بلا وجہ تمام مسائل پر فوقیت دے رہے ہیں ان الفاظ کی روشنی میں اپنے رویہ پر غور کر سکیں گے۔

خاص نمبر

ہم اپریل میں افکار کا خاص نمبر شائع کر رہے ہیں جس میں ہندوستان و پاکستان کے تمام ممتاز ادباء و شعراء حصہ لے رہے ہیں۔ پہلا خاص نمبر اردو ادب میں ایک گرانمایہ اضافہ تصور کیا جاتا ہے۔ دوسرا خاص نمبر ہمارے قارئین کے لئے ایک بیش بہا تحفہ ثابت ہوگا۔ اس ماہ کے آخر میں بھوپال میں کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس بھی ہو رہی ہے جس کی مکمل روداد اور شریک ہونیوالے ادباء کے رشحات فکر خاص نمبر کی زینت ہونگے۔ کل ہند کانفرنس میں جو حضرات شریک ہو رہے ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں:۔ علامہ سلیمان ندوی، پنڈت سندر لال، جوش ملیح آبادی، کرشن چندر، سردار جعفری، احتشام حسین، راجندر سنگھ، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، مجاز، غلام ربانی تاباں، ممتاز حسین، حبیب تنویر وغیرہ۔ خاص نمبر کی تفصیلات آئندہ اشاعت میں پیش کیجائینگی۔

اعتذار!

ہم اپنے قارئین سے دلی افسوس کے ساتھ پہلی بار معذرت خواہ ہیں کہ دسمبر کا افکار، دہلی سے کاغذ تاخیر سے موصول ہونے کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکا۔ آئندہ اشاعتوں میں ہم اس کی تلافی کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ اس ناگہانی اور غیر اختیاری صورت حال کے پیش نظر یقیناً افکار نواز ہماری صحیح مجبوریوں کا احساس فرمائیں گے

(ادارہ)

حنیف فوق

جہانِ تازہ

افادیت کی ترازو سے ہر شے کو تولنے والے انسان نے آج کی پُرشور دنیا میں سکونِ قلب کو جس طرح کھو دیا ہے اس کا اندازہ کسی جدید نمونے کی وزن بتانے والی مشین کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسے سمجھنے کے لئے دل و جود کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کرنا ضروری ہے اس میں شک نہیں کہ زندگی ہنگامے اور حرکت سے عبارت ہے۔ لیکن جس طرح تند آندھیاں اور شدید زلزلے برسوں سکون کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں بالکل اسی طرح زندگی کے افق پر چمکنے والی بجلیاں بھی خاموشی کی سازگار فضا میں جنم لیتی ہیں۔ بے چین و مضطرب مرغِ قبلہ نما ہوا کے رخ کو بتا سکتا ہے۔ لیکن بادِ مخالف کے تھپیڑے نہیں سہہ سکتا۔ لیکن زمین کے سینے میں قدم گاڑے ہوئے اہرامِ مصر اپنی پرسکون عظمت کے ساتھ صدیوں سے زمانے کے سرد و گرم کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ زندگی کے سارے طوفانوں کا مسکن بھی سمند جیسی گہرائیاں رکھنے والے سینے ہوتے ہیں۔ ورنہ ہوا کے ایک جھونکے سے منتشر ہو جانے والی ریگِ پریشاں —— کیا خاک ابدیت کے محل استوار کرے گی —— فطرت نے انسان کو خوابوں کی دولت اور حقیقت پسندی کی لذت بخشی۔ ایک جانب آسمان کی رفعتوں کو چھوتا ہوا سلسلۂ کوہسار، شاداب مرغزار، گنگناتے ہوئے دریا اور گیت گاتے ہوئے آبشار تھے۔ اور دوسری جانب انسان کو پھاڑ کھانے والے ہزاروں درندے اور ڈس لینے والے ہزاروں حشرات الارض بھی موجود تھے۔ ابتدائی عہد کے انسان کے ذہن پر اس تضاد نے جو نقوش مرتب کئے تھے آج کا انسان بھی ان سے چھٹکارا نہیں پا سکا ہے۔ اور پھر سرمائے اور محنت کے تصادم کے اس دور میں انفرادیت، اجتماعیت، قومیت، وطنیت اور بین الاقوامیت کے نظریوں میں کشمکش کی وجہ سے ذہنی الجھنوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ آرٹ اگر ہمیں ایک لمحۂ خود فراموشی بہم پہونچاتا ہے تو اسی کے ساتھ ساتھ ان تمام حقیقتوں کا واضح شعور اور بیدار ادراک بھی بخشتا ہے۔ لیکن آرٹ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ غم جانفزا اور کشمکش طرب آگیں معلوم ہونے لگتی ہے۔ ہمارے ذہنوں میں شکست رسیدگی ہوتے ہوئے بھی آرٹ کا حسن روح کو وہ بالیدگی عطا کرتا ہے کہ آرٹ متاعِ شکست نہیں رہتا۔ بلکہ ارتقاعِ زندگی بن جاتا ہے۔ سحر و شام نغمۂ درد سے بھرپور ہوں لیکن دل پھر بھی کیف خیال سے معمور ہوتا ہے۔ جس طرح پودا زمین سے غذا حاصل کرتا، فضا سے نمو کی صلاحیت لیتا اور کرنوں سے رنگ اخذ کرتا ہے اور آخر کار پھول کی شکل میں اپنی ساری کاوشیں بروئے کار لاتا ہے اسی طرح آرٹ زندگی کے مشاہدے اور تجربے سے غذا حاصل کرتا، ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں سے نشو و نما پاتا اور اظہار کے رنگوں سے آراستہ ہو کر بہارِ شام جان کو معطر کرتا ہے —— آرٹ کے متوالوں سے گذر کر بات جب عقل کے دیوانوں تک پہونچتی ہے تو کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ رات کی خموشیوں میں دل کو نین کی دھڑکنوں اور فضائے عالم کی سرگوشیوں سے ناواقف پوچھتے ہیں کہ کیا یہ مطمئن قلب یہ اداس دل اور یہ کھوئی ہوئی نگاہ ہی آرٹ کی ساری کائنات ہے؟ —— دراصل سرمایہ دارانہ نظام میں پرورش پائی ہوئی تاجرانہ ذہنیتیں پانے کے مفہوم سے واقف ہیں۔ لیکن کھونے کا لطف نہیں جانتیں۔ انھیں یہ نہیں معلوم کہ دانائی سے بڑھ کر کوئی نادانی نہیں ہے۔ اس کا احساس بھی انھیں نہیں ہے کہ فطرتِ انسانی کی ترکیب میں کیسے متضاد عناصر کارفرما ہیں۔ ایک جانب زندگی کی تلخ اور ٹھوس حقیقتیں ہیں اور دوسری جانب انسانی ذہن کی مثالیت پسندی (Idealism) ذوقِ پرواز بھی ہے اور پرو بال بھی نہیں ہیں۔ اسی لئے فطرت اور حالات کے ہاتھوں انسان جس کشاکش میں مبتلا ہے وہ بڑی گہری اور دردناک حقیقت ہے۔ اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوگا کہ خود انسان شعورِ ذات اور عرفانِ انسانیت سے محروم رہے، لیکن ستم بالائے ستم یہ ہے کہ انسان اپنی بلندی کی حدوں سے بیگانۂ محض بھی نہیں ہے۔ اسے اگر ایک جانب پستیوں میں

اُدھر اگر اس عالم ناگہ، و بادسموم آہنگی پیدا کرنی پڑی ہے تو دوسری جانب ہر لمحہ ان درخشاں تاروں میں، شام و سحر کے جلووں میں اور حسن کے تمام مظاہر میں اس آورش کی جھلک نظر آتی ہے جسے اس کی نگاہیں ڈھونڈھتی رہیں مگر پا نہیں سکیں ——— ہمارے یہاں عقل کے ایسے بلند بانگ دعویداروں کو (جن میں خیر سے ہمارے ترقی پسند نقاد بھی شامل ہیں) اب تک دوسروں کی نظروں سے دیکھنے کی عادت رہی ہے اور شخصی غور و فکر کی سعادت نصیب نہیں ہوئی ہے اسی لئے بہت کچھ باتیں بتلانے کے باوجود یہ لوگ آرٹ کے متعلق ارسطو کے "زندگی کی نقالی" والے فرسودہ نظریئے سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں اور نہیں جانتے ہیں کہ زندگی خواب کی طرح فسوں کار بھی ہے اور موت کی طرح جفاکار بھی، لیکن اس ناواقفیت کے باوجود ان کی شور و غل کا عالم یہ ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی - ہر طرف زندگی کی پکار ہے - حالانکہ آرٹ میں اگر زندگی ملتی بھی ہے تو اس وقت جب تخلیقی صلاحیتوں کی بھٹی میں تپ کر کندن بن چکی ہو - زندگی اپنی ساری کثافتوں سے بلند ہو کر نکھری نکھرائی ہوئی پاکیزہ اور منزہ شکل میں آرٹ کے حضور میں حاضر ہوتی ہے - دراصل آرٹسٹ لیڈی شیلاٹ (Lady Shallot) کی طرح تخلیق کے آئینہ میں زندگی کی صرف جھلکیاں ہی دیکھ سکتا ہے - یا دوسرے لفظوں میں وہ آرٹ کے جزیرے سے ہر لمحہ پیچ و تاب کھاتی ہوئی زندگی کی موجوں کا جائزہ لیتا رہتا ہے لیکن ان موجوں میں ڈوب جانا خود اس کے اور آرٹ دونوں کے لئے کوئی نیک فال نہیں ہے، لیکن عقل کے یہ دعویدار جوشیلے آرٹ کو زندگی کا کوڑا کرکٹ صاف کرنیوالا سمجھتے ہیں - دیکھئے کب تک وہ ان موجوں نے نبرد آزمائی کے لئے پیچھے ڈھکیل نہ دیں ——— آرٹ اگر صرف زندگی کا نقیب ہو تو اس کی اہمیت زندگی کے دیگر مظاہر سے زیادہ نہیں ہوسکتی لیکن اگر ہم غور کریں تو خود انسانی زندگی کی قدر و قیمت کا تعین بھی اس سے نہیں ہوتا کہ کتنی صبحیں دولت کا انبار لگانے میں صرف ہوئی ہیں اور کتنی شامیں ان سے خرچ کرنے میں - اسی طرح رہائش اور زیبائش کی مختلف تغیریں بھی زندگی کا معیار نہیں بن سکتیں - جس طرح خالص شخصی نقطہ نظر زندگی کو پورے طور سے سمجھنے میں ناکام رہتا ہے اسی طرح صرف اجتماعی انداز فکر بھی اس کی ساری وسعتوں کا احاطہ نہیں کرسکتا - دراصل زندگی کو پرکھنے کے لئے انسانی نسل کے لامتناہی سلسلے کو کائنات کی خفتہ موسیقی کے پس منظر اور انگڑائی لیکر بیدار ہوتی ہوئی فطرت کی سرمستی کے پیش منظر میں رکھ کر دیکھنا پڑیگا ——— حیات و کائنات کی دور دور تک پھیلی ہوئی اس فضائے بسیط کا ایک ذرہ انسان بھی ہے، لیکن کتنا شوخ کتنا گستاخ ——— جو لیلائے زندگی کی کاکل شبگوں کا اسیر ہوتے ہوئے بھی اس کی تسخیر کی کوششوں سے غافل نہیں ہے - جسے اس نگار دل آرا نے سیکڑوں فریب دیئے، لیکن ہر فریب کے بعد جس کا اپنی قوت نفس پر اعتماد گہرا ہوتا گیا - اس میں شک نہیں کہ اس کے ذہن پر بھی جب زندگی کی تلخ کامیاں اپنا بھیانک عکس ڈالتی ہیں تو وہ سوچنے لگتا ہے کہ اس دور زندگی سے کہیں موت بہتر نہیں - عورت اور شراب کی پناہ گاہ سے لیکر آرٹ کی مقدس چہار دیواری تک ہر جگہ درد کی نے گونجی ہوئی ہے لیکن اس دائم کسک کے باوجود انسان کے عزم محکم کو آج تک کوئی طاقت شکست نہیں دے سکی ہے اور انسانیت کے سلسلۂ ارتقاء میں کوئی شے دیوار بن کر حائل نہیں ہوسکی ہے - وہ بگڑ بگڑ کر بنتا ہے اور ہر شکست کے بعد نئے عزم سے زندگی کی ابتداء کرتا ہے - آگ اور خون کی بہت سی راہوں سے گذر کر انسان اپنی منزل کی جانب گامزن ہے اور یہ وہ منزل ہے کہ جہاں اپنی خودشناسی کے انداز جنوں میں انسان اس کیفیت والہانہ سے سرشار ہو جاتا ہے کہ مہر و ماہ کی حیثیت بھی گرد راہ سے زیادہ نہیں رہ جاتی - آرٹ انسان کی اسی بلند نظری کا پرتو ہے - اس کا مطالعہ حقیقتوں سے نظریں ملا کر تصور کی راہوں سے گذرنا سکھاتا ہے اور حقائق کی ٹھوس چٹانوں پر خوابوں کی رس و نازک ضیاء بکھیر دیتا ہے ——— ہمیں آرٹ میں غم کی لذت کے ساتھ ساتھ حسن امید کی تازگی بھی ملتی ہے - یہاں تک کہ آرٹ میں فرد بھی زندگی کو نئے زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کا نام ہے - اسی لئے ہر سچا فنکار جہاں اپنے تخیل کی گلکاریوں سے "جہان تازہ" کی تخلیق کرتا ہے، وہیں اس عالم آب و گل کی ان غیر محسوس حقیقتوں کو بھی بے نقاب کر دیتا ہے -

زندگی سے آرٹ کا رشتہ ایسا ابدی اور مستحکم ہے کہ جسے فنکار خود بھی توڑنا چاہے تو نہیں توڑ سکتا - اس میں شک نہیں کہ فن کا آزاد پرندہ بلند و بالا فضاؤں میں پرواز کرتا ہے، لیکن گرد و پیش اور سمت و جہت کے احساس سے غافل نہیں ہوتا - اس کے باوجود فن صرف حقیقت کو پیش نہیں کرتا بلکہ ہمیں اس آئینہ میں اس باطنی صداقت کی جلوہ گری نظر آتی ہے جو کائنات اور موجودات اور ذہن انسانی کی تصورات میں بیک وقت کارفرما ہے - اس طرح آرٹ حیات و کائنات کو قریب تر لاتا ہے اور تصور کو عالم محسوسات سے مطابقت بخشتا ہے -

(باقی صفحہ ۵ پر ملاحظہ فرمائیے)

نیرنگ
دیوار
رنگ آمیزی
یہ ایک زخم
اُس کی یادیں
آہٹیں
دو غزلیں
دو غزلیں

آبگینے

حقیقی شعر کائنات کی حسین ترین تفسیر ہے!

نیرنگ

مزاجِ دہر ہے کیسا تلوّن آشنا اختر
عجب دیکھا عجب پایا زمانے کا چلن میں نے

کبھی کھلتے ہوئے پھولوں کو پایا ریگزاروں میں
کبھی بجتے ہوئے کانٹوں سے دیکھی انجمن میں نے

دہکتی آگ کا شعلہ کبھی لالہ نظر آیا !!
چھلکتے جام پر دیکھی کبھی خونیں کرن میں نے

کبھی خود دستِ یوسف شوق میں بڑھتا نظر آیا
زلیخا کا کبھی خود چاک دیکھا پیرہن میں نے

کبھی رہزن کو یاں بھٹکے ہوؤں کا رہنما پایا
کبھی رہبر کو خود رستے میں پایا راہزن میں نے

کبھی ظالم کو یاں مظلوم کے احوال میں پایا
کبھی قاتل کو خود باندھی ہوئی دیکھا کفن میں نے

محبت کی جھلک پائی نگاہِ قہرِ دشمن میں
جبینِ دوست پر دیکھی عداوت کی شکن میں نے

کبھی نالوں سے جاگیں قوتیں سوئی ہوئی دل کی
کبھی نعروں کو پایا اور بھی ہمت شکن میں نے

کبھی محنت کو یاں افلاس پر روتی ہوئی دیکھا
کبھی افلاس کو دولت پہ پایا خندہ زن میں نے

کبھی ابلیس میں بیدار دیکھی روح نیکی کی
کبھی یزداں میں خود پایا دماغِ اہرمن میں نے

کہاں تک دہر کی نیرنگیوں کی داستاں اختر
غرض کیا کیا نہیں دیکھا ہے رنگِ انجمن میں نے

جاں نثار اختر

دیوار!

یہ اندھیرے
یہ اندھیروں میں گرجتے ہوئے طوفان کا شور
مرا ماضی
مری خوں گشتہ امیدوں کا مزار
یہ روایاتِ کہن
اور غمِ ایام کے رِستے ہوئے زخم
جیسے دیوارِ گذرگاہِ تمدّن کے شگاف۔
وقت کے پھیلتے، بڑھتے ہوئے سایوں کو لئے
آج بھی ظلمتِ دوراں ہے شریکِ غمِ زیست!

★

آج
اور آج کے خوابوں کا سنہری گنبد
اپنے ماضی کی روایات پہ ہے نوحہ کناں
جس کے اطراف میں صدیوں کی طرح
آج بھی سیکڑوں بھوکوں کی قطاریں ہیں کھڑی
کارخانوں کے، دفاتر کے، ملوں کے آگے
اور کھلیانوں کے، بازاروں کے، چوراہوں کے
اردگرد ایک قطار
ایک لمبی سی قطار

لوگ کہتے ہیں "یہ بھوکے ہیں، یہ ننگے ہیں غریب"
"کون کہتا ہے یہ ننگے ہیں، یہ بھوکے ہیں غریب"
چیخ کر دیتے ہیں ایوانِ حکومت یہ جواب

یہ اندھیرے
یہ اندھیروں کی کمیں گہ کے لٹیروں کا فریب
سامراجوں کا فریب
آمریت کا فروغ
اور جنتا کی حکومت کا دروغ

★

آج لَو دیتے بھڑک اُٹھے ہیں رِستے ہوئے زخم
ان اندھیروں سے کہو
ان اندھیروں کی کمیں گہ کے لٹیروں سے کہو
دور ہو جائیں نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے
کل جو دیوار تھی ماضی کے اندھیروں کی امیں
آج، کچلے ہوئے انسان گرائیں گے اُسے۔

★

سُرخیٔ خوں کی طرح سُرخ ہے فردا کی بہار
روشنی لیکے بڑھو، اور بڑھو اور بڑھو!

صہبا اختر

رنگ آمیزی

سفید کھدر

سفید — شفاف و صاف کھدر
ہمالیہ کی بلند چوٹی پہ جیسے دوشیزہ برف کی تہہ جمی ہوئی ہو۔
چمک رہی ہے — دمک رہی ہے
حسین منظر
حسین اور دلفریب منظر — جو دور ہی سے نظارہ کیجئے
ہزاروں سیاح — بھولے بھالے
جنھوں نے اس وادیٔ خزاں کو بہشت نکہت و رنگ سمجھا
ہوئے بچارے
شکار مرگ سفید آخر
شفق کی سرخی
بلند برفانی چوٹیوں پر بکھیر دیتی ہے رنگ جیسے
لہو کی چھینٹوں نے آج ساتھی سفید کھدر میں کس قدر رنگ بھر دیا ہے
فضا کو گلنار کر دیا ہے
ہزاروں غنچے خزاں کے سینہ سے پھوٹ نکلے
بہار شاید قریب ہے اب

غلام ربانی تاباں

یہ ایک زخم

(فسادات سے متاثر ہو کر)

پڑی ہے خاک پہ خانماں کوئی بچی — ذرا سی جان پہ خنجر کے زخم کھائے ہوئے
چھڑا دیا ہے جو دنیا نے ماں کی گودی سے — زمیں ہے سینے سے ماں کی طرح لگائے ہوئے
منا رہی ہے یہ بچی بھی جشن آزادی — لہو کی بوند کے ننھے دیے جلائے ہوئے
یہ انتقام کا خنجر یہ شیر خوار حیات — بہادروں کی شرافت ہے سر جھکائے ہوئے
بجھا دیا جسے ظلمت کی سرخ آندھی نے — وہ زندگی تھی سنہری کنول جلائے ہوئے
سہاگ رات کوئی دیکھتا سنگار اس کے — جگر کا خون ہے جس کو دلہن بنائے ہوئے
کوئی حسین سا پھول اس کی گود میں کھلتا — نئی بہار کو آغوش میں چھپائے ہوئے
عجب نہیں کہ وہ جانباز لکشمی ہوتی — کہ اس کے عزم بھی ہیں خون میں نہائے ہوئے
شباب میں نظر آتی وہ چاند سلطانہ — کہ اس کا حسن بھی پرچم سا ہے اٹھائے ہوئے
وہ کھیلتی تھی مگر زندگی کے سینے میں — جدید غالب و ٹیگور کو چھپائے ہوئے
اس ایک پھول سی بچی کی قاتلو دیکھو — گڑی ہے خاک میں کتنے چمن جلائے ہوئے
یہ لاش ہے کہ پڑے ہیں کھنڈر کے دامن میں — جدید تاج و اجنتا کی طاق ڈھائے ہوئے
ٹپک رہا ہے لہو صنعتی فضاؤں سے — نئے جہاز ہر اک بوند میں چھپائے ہوئے
پڑی ہیں خاک پہ بچی کی شکل میں کیا کیا — محل تمدن و تہذیب کے مٹائے ہوئے
جو سینچتی کبھی انسانیت کی کھیتی کو — بجائے شیر وہ چھاتی ہے خون بہائے ہوئے
وہ ارتقا ہے وہ انسانیت وہ آزادی — زمانہ ہے جسے خوں میں کفن پہنائے ہوئے
یہ قتل شاعر و نقاش و فلسفی کا ہے قتل — یہ ایک زخم ہے کتنے لہو بہائے ہوئے

خبر نہیں تمہیں شاید یہ جی بھی سکتی ہے — کہ زندگی ہے ابھی آسرا لگائے ہوئے
اٹھا کے پھینک دو خنجر کو اور زخموں پر — چھڑک دو چشم ندامت سے اشک آئے ہوئے
یہ ممکنا کہ ابھی اٹھ پڑے گی ہنستی ہوئی
نئے گھروندوں سے تخئیل کو بسائے ہوئے

شمیم کرہانی

اُس کی یاد میں

زندگی جہد و عمل سے ہی کچھ ایسی آباد
غمِ افراد کہیں بار نہیں پا سکتا
حال اِتنا ہے سزاوارِ توجہ کہ مجھے
عہدِ ماضی کا تصور بھی نہیں آسکتا
آہی جاتی ہے مگر آج بھی مجھ کو تری یاد
جب تری دُھن میں ترا گیت کوئی گاتا ہے

تیرے خاکوں میں ادھورا تھا ابھی رنگِ عمل
سرد کیوں ہو گئے تکمیل سے پہلے تیرے ہاتھ
"سرخ منزل" کی طرف میں بھی رواں ہوں لیکن
مجھ کو ڈر ہے کہ کہیں جسم نہ چھوڑے مرا ساتھ
وہی بیچارگیٔ جاں، وہی بیتابیٔ شوق
دیکھ کر خود کو مجھے تیرا خیال آتا ہے

تجھ سے ملنے کے لئے، تیری مکاں کی جانب
آج بھی از خود و بے قصد چلا جاتا ہوں
جز تری یاد وہاں کچھ بھی نہ ہوگا لیکن
اس حقیقت کو سمجھ کر بھی میں جھٹلاتا ہوں
زندگی سے تری مانوس رہا ہے اتنا
تیرے مرنے کا یقیں دل کو نہیں آتا ہے

کتنا ارمان تھا تجھ کو کہ ہو آزاد وطن
اور تو اُس کی فضاؤں میں رہے زندہ و شاد
کس قدر رنج تھا جب تو نے یہ پایا کہ ابھی
یوں ہے آزاد وطن جیسے نہیں ہے آزاد
اور تو جی نہ سکی اور یہ سب کہتے ہیں
"جو بھی ہم چاہیں وہی تو نہیں ہو جاتا ہے"

وہ خیالوں کا تصادم، وہ عقائد کا تضاد
پھر بھی انفاس میں وہ ایک ہم آہنگی ساز
عشق کیا کہئے اسی عشق تو ہے عام سی شے
آہ اِک خاص وہ نسبت جو رہی مجھ سے بھی راز
اور یہ راز کھلا یوں کہ نہ ہونے سے ترے
ایک احساس ہے جو درد بنا جاتا ہے

پھر بھی تاریخ بتاتی ہے کہ انسانوں نے
جو بھی چاہا وہ کیا، جو نہیں چاہا نہ کیا
اس لئے جان دی تو نے کہ کوئی کہہ نہ سکے
ارتقا کے لئے مرنا بھی گوارا نہ کیا
اپنی ناکام تمناؤں سے گھبراتا ہے
دلِ ناداں تجھے جینا ہی نہیں آتا ہے

احسن علی خاں

آہٹیں

کوئی آتا ہے مری سمت۔؟ یہ کون آتا ہے
میری تنہائی کی رعنائی لئے جاتا ہے!
آہٹو! دور رہو!! مجھ کو ذرا سوچنے دو!!!
میرے شیرازۂ تخئیل کو برہم نہ کرو!!!

کتنے ناسور ہیں سینے میں لئے بیٹھا ہوں
دل میں طوفاں ہے مگر ہونٹ سئے بیٹھا ہوں
رازِ دل جس سے کہوں مجھ پہ دھریگا الزام
"خوب! دیوانے کی باتوں میں عمل کا پیغام!!"
ہاں میں دیوانہ ——! مری فکر و نظر ناکارہ
میری تخئیل غلط —— میرے خیال آوارہ
مجھ کو خوابوں کے جزیروں میں سفر کرنے دو
اپنی دنیا کے نشیبوں پہ نظر کرنے دو !!

جنوری بیت چکی —— سرد ہوا ہی اب تک
نور پھیلا ہے مگر تیرہ فضا ہے اب تک
آندھیاں آئیں —— بڑے شور سے طوفان اٹھا
امن و آزادی کی راہوں میں اندھیرا ہی رہا
رہنما کتنے بڑھے —— کتنے پھریرے لہرائے
اور حاصل؟ وہی خوں ریز دھندلکے، وہی سائے
ابن آدم کی یہ رفعت! یہ ترقی !! یہ کمال!!!
آستیں اُلٹے ہوئے —— تیغ بکف —— رخ پہ جلال

موت کے کھیل میں یہ جوش! یہ جذبہ! یہ خروش!!
خالقِ ارض و سما بھی ہے تحیر میں خموش!!!
آسماں آگ کے شعلوں میں جھلس جائے گا
کرۂ ارض پہ انساں نہ نظر آئے گا

سوچتا ہوں کہ یہ کیا ہوتا ہے؟ کیا ہونا ہے؟
جوہرِ عظمتِ آدم کو یونہی کھونا ہے؟!
آہٹو! دور رہو!! مجھ کو پریشاں نہ کرو!!
اپنی تخئیل کی پرواز میں کھو جانے دو!
یہ فضا تیرہ و تار اور یہ اداسی، یہ دھواں
میری منزل ہے کدھر —؟ جادۂ منزل ہے کہاں
تیرگی ہر در و دیوار سے لپٹی ہے تو کیا!!
بے بسی آدمِ بیمار سے لپٹی ہے تو کیا!!
کور چشموں کو مجھے اپنی نظر دینی ہے!!
اک نئے دور کی آمد کی خبر دینی ہے!!
اسی امید پہ جینے کا سہارا ہوگا !!
رات کی زلف ہٹے گی تو اجالا ہوگا!!

کون آتا ہے مگر رات کے اندھیاروں میں؟
ایک افسردہ سی ہلچل ہے بپا تاروں میں!
آہٹیں اور پُر اسرار ہوئی جاتی ہیں!!
کیا نئی صبح کے سورج کی خبر لاتی ہیں؟!

اشعر ملیح آبادی

دو غزلیں

سُن رازِ حقیقت سُن ہم سے، اک حسن و عشق کی محفل ہے
مدہوش یہاں کا ہوش میں ہے، ہشیار یہاں کا غافل ہے
میں روتا ہوں وہ ہنستے ہیں، اللہ یہ کیسی مشکل ہے
دل اُن پہ فدا وہ دل سے خفا، اک دل ہے اک وہ دل ہے
پیچیدہ رستے عشق کے ہیں، منزل پہ رسائی مشکل ہے
اک پردہ بیچ سے اُٹھتا ہی، اک پردہ بیچ میں حائل ہے
جب آنکھ ملی تو خوش خوش تھا، اب ہجر خوشی کا حاصل ہے
وہ عشق کا پہلا زینہ تھا، یہ عشق کی پہلی منزل ہے
اے عشق تری ہر بات نئی، اے عشق ترا ہر کام نیا
جو مشکل ہے وہ آساں ہی، جو آساں ہے وہ مشکل ہے
دل مجھ سے کہتا جاتا ہی، منزل ملنا آساں نہیں
میں دل سے کہتا جاتا ہوں وہ منزل ہے وہ منزل ہے
اسرارِ حقیقت سمجھا دے، انوارِ حقیقت دکھلا دے
سب عشق جسے کہتے ہیں ذکی، وہ مرشد ہے وہ کامل ہے

ذکی بھوپالی

★

گلستاں کی ہر ہر کلی مسکرائی
جو تم آئے تو چاندنی مسکرائی

زمانے کی ہر مطمئن خاطری پر
تری زلف کی برہمی مسکرائی

مبارک تھا کتنا ترا حسنِ حیرت
مرے ہوش پر بیخودی مسکرائی

جھکے پھول سجدے میں بہرِ عقیدت
تمھیں دیکھ کر چاندنی مسکرائی

ترے عشق میں موت کی کشمکش پر
مری حسرتِ زندگی مسکرائی

ترے لطفِ بےحد میں تھی اتنی وسعت
مرے حوصلہ کی کمی مسکرائی

وہی لمحہ تھا حاصلِ عمر ثاقب
کہ جب موت پر زندگی مسکرائی

ثاقب کانپوری

★

دو غزلیں

ہو سکے پھر نہ مسیحا سے مداوا جس کا
اے دل اپنی خلش درد کو اتنا نہ بڑھا

تجھ سے اے دوست نہیں اپنی تباہی کا گلا
مجھ سے مجبور ہو مجھ سے نگاہیں نہ چرا

جب لرزنے لگے اک اشک تری پلکوں پر
پھر میں سمجھوں مری قسمت کا ستارا چمکا

نہیں سکتی ہے وقار غم ہستی کو مرے
التفات نگہ ناز کو اتنا نہ بڑھا

یہ جہان مہ و خورشید یہ گلہائے چمن
میں نے دیکھا ہی نہیں کچھ تری آنکھوں کے سوا

میرے کانوں میں صدائیں سی یہ کیا آتی ہیں
مطرب ساز کی لے اور بڑھا اور بڑھا

میرے سینہ میں یہ احساس کی دھڑکن کیسی
ساقیا اور پلا، اور پلا، اور پلا !!!!

کچھ زمانہ کی امیدوں کو بھی دینا ہے جواب
اپنی موہوم سی امید پہ جینا کیسا !

تک رہی ہیں مرا رستہ ابھی کتنی راہیں
اے دل آسودگی شوق کو منزل نہ بنا

انہی طوفانوں کے آغوش میں ہے راز سکوں
انہی بہتی ہوئی موجوں میں ہے ساحل میرا

عمر بھر مجھ کو زمانہ نے ابھارا اختر
عمر بھر ان کی نگاہوں نے ابھرنے نہ دیا

اختر سعید (ملیگ)

تمام دشت و بیاباں تمام ویرانے
جہاں بھی بیٹھے ہیں جا جا کے تیرے دیوانے

تمہارے جلووں سے معمور اک چمن ہی نہیں
دلوں کے پاس بھی آباد ہیں پریخانے

کوئی بتائے کہ کس حال میں ہیں بادہ گسار
کہ مدتوں سے کھنکتے نہیں ہیں پیمانے

میں جن کے ذکر کی تلخی سے آچکا تھا تنگ
وہی سنانے پڑے ہیں یہاں بھی افسانے

ترے جمال کی رعنائی کے سوا اے دوست
نگاہ عشق کی ہستی کو کون پہچانے

تری نگاہ نے پیہم دیئے ہیں جس کو فریب
خنک ہوائیں چلیں اس کو اور بہکانے

اگرچہ مجھ کو توقع بہت تھی دنیا سے
کوئی بھی آیا نہ چوٹوں کو دل کی سہلانے

زمانہ گوش بر آواز ہی نہیں افسوس!
سنا رہا ہوں کب سے وفا کے افسانے

تمہارا درد جدائی بھی راس آ نہ سکا
کچھ اس طرح ہوئے ویراں دلوں کے کاشانے

سنا ہے آج وہ خود ڈھونڈھنے کو آئے تھے
نہ جانے ایسے میں اختر کہاں تھے دیوانے

اختر ہوشیارپوری

زندگی یوں بھی.....
سلاخوں کے پیچھے
بھاگسوناتھ
لاش کے گرد

انشا

ہر حقیقت ایک خاموش افسانہ ہے اور ہر افسانہ ایک خاموش حقیقت!

دیویندر اسر

زندگی یوں بھی......

ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں مندروں کے سنہری کلس چومتی اور سربفلک برفانی چوٹیوں پر ناچتی جب دور اُن اُنگی پہاڑوں میں چھپ جاتیں، اور بام و در پر سے پھیلتے ہوئے، اداس سائے زمین پر پھیلنے لگتے تو بوڑھا فضل دین، اپنے نحیف شانوں پر چھوٹی سی سیڑھی اُٹھائے گلی کے موڑ پر رک جاتا تھا۔ چند منٹ تک وہ زور زور سے کھانستا جس سے اُس کی دونوں طرف کی پسلیوں کے درمیان نالی سی بنجاتی اور غائب ہوجاتی تھی۔ وہ چراغ جلانے کے لئے چمنی اُتار کر اپنے گھٹنوں میں دبالیا کرتا تھا۔ دیاسلائی سلگاتے ہوئے اُس کے نکرہی جیسے خشک پاؤں لرزنے لگتے اور بانس کی سیڑھی اُس کی خمیدہ کمر کی طرح جھک جاتی۔ اسی وقت کسی مسجد سے مغرب کی اذان گونجتی، اور فضل دین چمنی اپنی جگہ پر ٹکا کر اور کیس بند کر کے خدائے دوجہان کا کلمہ پڑھتا ہوا نیچے اُتر آتا اور کندھے پر سیڑھی اُٹھا کر دھیرے دھیرے کسی تھکے ماندے راہوار کی مانند واپس چلا جاتا۔ اس کی جھکی ہوئی کمر دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ دھرتی بیل کے سینگ کے بجائے اُس کی پیٹھ پر لدی ہوئی ہے اور بوڑھا فضل دین دھرتی کے مکانوں، سیناؤں، کھیتوں، ملوں، اور پہاڑوں کو عظیم بوجھ تلے دبا جارہا ہے چراغ روشن کرنا فضل دین کا آبائی پیشہ تھا۔ فضل دین کو دیکھ کر میری حس لطیف کو سخت ٹھیس پہونچتی تھی۔ اس کا جلا ہوا چہرہ کچے گوشت کی مانند تھا۔ جس پر سیاہ گٹھلی چپاں تھی۔ اس کی آنکھوں سے ہمیشہ میلا پانی رستا رہتا تھا۔ جس سے اُس کی ڈاڑھی داغدار ہوجاتی تھی۔

فضل دین چراغ کی زرد روشنی میں بیاباں کے کسی بھوت کی مانند نظر آتا تھا جو بھولے بھٹکے آدم کی بستی میں آکر پریشان ہوجائے۔ میں بوڑھے کے کروہ چہرے سے نظریں ہٹا کر اینگلو انڈین منصف کے دریچوں میں لٹکے ہوئے رنگین ریشمی پردوں میں گاڑدیتا۔ سبز سبز پردے ہوا میں اس طرح ہلتے جیسے کسی شانت جھیل میں ہلکی ہلکی لہریں اُٹھ رہی ہوں۔ کبھی کبھی جب ہوا کا تیز جھونکا اِن پردوں کو ایک طرف سرکا دیتا تو پیانو پر پڑی ہوئی سارہ کی تصویر نظر آجاتی۔ میری نگاہیں اِن پردوں میں کھوئی رہتیں۔ حتّٰی کہ بوڑھا گلی کے موڑ پر غالب کی غزل اپنی بے سُری آواز میں گاتا ہوا غائب ہوجاتا۔ وہ اُس وقت کیوں نہ مرگیا، جب اُس کی جھونپڑی پر بجلی گری تھی۔ کبھی کبھی دل میں دبی دبی خواہش اُٹھتی کہ بوڑھے کے نیچے سے سیڑھی کھسک جائے اور وہ دھم سے زمین پر آرہے اور گرتے ہی دم توڑ دے۔ تاکہ ایسے کروہ چہروں کو دیکھنے سے نجات ملے۔

لیکن بوڑھا زندہ رہا اور آندھی اور بارش میں بھی سرِشام چراغ جلانے کے لئے موجود ہوتا۔ گلی کا یہ چراغ شام ہی سے بجھا بجھا سا رہتا تھا۔ شاید تیل کی کمی تھی یا سالہا سال سے جلنے کی وجہ سے بتی چھوٹی ہوگئی تھی۔ مگر چمنی بھی تو دھندلی ہو چکی تھی۔ اس لئے روشنی مدھم مدھم سی مٹیالی جان پڑتی۔ چراغ کے کیس پر بارش کی بوندوں اور ریت کے ذروں نے اپنے بیشمار نشانات چھوڑ دیئے تھے۔ جب سامنے والی دیوار پر روشنی کا زرد ہالا پڑتا تو اس میں چھوٹے بڑے سیاہ دھبے چراغ کی لو کے ساتھ ساتھ رقص کرتے تھے۔ اس وقت شیشم کی بوڑھی شاخوں سے پیلے ماہتاب کی کرنیں کا نٹات پر اس طرح پڑتیں جیسے کسی یرقان کے مریض پر موت کے سائے لرز رہے ہوں، چراغ کے کیس کے اندر ہزاروں پتنگوں کے جلے ہوئے پر بکھرے پڑے تھے اور اس کے گرد سینکڑوں پروانے روشنی کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی سعی ناکام میں منڈلاتی ہوئی موت سے ہمکنار ہو جاتے تھے۔ چراغ کے ساتھ ہی دیوار پر ایک چمگادڑ نے بسیرا کر رکھا تھا جو کبھی کبھی انتہائی بیقراری کے عالم میں اِدھر اُدھر دوڑتی پھرتی تھی۔ جب میں دن بھر کی مسافت کے بعد پریس کو رپورٹیں بھیجکر اپنے آسیب زدہ کمرے میں قدم رکھتا تھا تو چراغ کی مدھم روشنی میں چمگادڑ کی سرسامی حالت ایک عجیب افسردہ کیفیت پیدا کر دیتی جس سے ماحول کی یاسیت اور بھی گہری ہوجاتی۔

اس گلی نے تاریکی میں جنم لیا تھا، اور تاریکی ہی میں مر جائیگی اور یہ چراغ ہمیشہ دُنگتا رہیگا۔ نور خورشید سے محروم اس گلی میں ہزاروں

اقسام کے مہلک جراثیم رینگتے رہتے تھے، جو گندی نالیوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر زندگی کو خوش آمدید کہہ رہے تھے اور اپنی تعداد میں ہر لمحہ اضافہ کر رہے تھے۔ چند مکانوں کے پاخانے بھی اس گلی میں کھلتے تھے۔ صاف و شفاف سیمنٹیلے روڈ کے دائیں طرف واقع عالیشان عمارتوں کے مکینوں نے راہ گیروں کے حواس خمسہ کی تسکین کے لئے ہر چیز فراہم کر رکھی تھی۔ مٹی کے ڈھیلے اور اڑتے ہوئے تنکے، کچی سبزیوں اور انڈوں کے چھلکے، مرغیوں کے ٹوٹے ہوئے پر۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ۔ خون میں لتھڑے ہوئے چیتھڑے، الجھے ہوئے بالوں کے گچھے۔ دوائیوں کی ٹوٹی ہوئی شیشیاں۔ پچکے ہوئے ڈبے۔ گلے سڑے پھل۔ اور کوڑے کرکٹ کے بدبودار ڈھیر اس بھیگی ہوئی گلی کو زینت بخش رہے تھے۔ بعض اوقات اجنبی تماشائیوں کی تفریح طبع کے لئے محلے کے چھوٹے چھوٹے بچے نالی کے کنارے قطار باندھ کر بیٹھ جاتے، اور ایک دو تین کہکر قدرت کی صدا کا کچھ اس انداز سے جواب دیتے کہ راہ چلنے والوں کو مجبوراً اپنی ناک پر ہاتھ یا رومال رکھنا پڑتا۔ گلی کی فضا میں ہمیشہ جلی ہوئی گندھک کی بو بسی رہتی تھی۔ گندگی اور غلاظت کے ڈھیر پر خارش زدہ کتے تھوتھنہ مار کر چلے جاتے یا وہیں دیوار سے لگ کر سو جاتے تھے۔ وہ کبھی کبھی پاؤں کی چاپ سنکر چونک پڑتے اور بھونک کر چپ ہو جاتے تھے۔ گلی سے گذرنے والے لوگ بارہا کانچ کے ٹکڑوں سے اپنے ننگے پاؤں زخمی کر لیتے یا کیلے کے چھلکوں پر سے پھسل کر نالی میں گرتے گرتے بچتے، جس میں صابن کی میل گھناؤنے خیالوں کی طرح بہتی رہتی۔ اس گلی کی ہر شے تغیر پذیر تھی۔ فقط غلاظت کو ہی دوام حاصل تھا۔ یہی روز مرہ کا معمول تھا۔ لوگ آتے۔ تھوتھنہ کے بل گرتے اور گذر جاتے تھے۔ اور وہ سانولی لڑکی بھی اپنا آنچل کو سنبھالتی چراغ کے جلتے ہی گلی میں داخل ہوتی اور سیدھی گذر جاتی۔ وہ کئی مہینوں سے لگاتار اس طرح آتی اور چلی جاتی تھی۔ جب میں نے اُسے پہلے پہل دیکھا تو اُس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری نظر آیا تھا۔ جیسے یہ لڑکی کچھ جانتی ہی نہیں۔ کچھ سوچتی ہی نہیں اور کچھ محسوس نہیں کرتی اُس کے خاموش ہونٹوں پر تبسم اور کرب کی ہلکی ہلکی لہریں ایک پُر اسرار امتزاج پیدا کر دیتی تھیں۔ جیسے یہ لڑکی کسی کرب سے گذر رہی تھی۔ لیکن مستقبل کا جانبخش خیال اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کر دیتا تھا۔ جونہی یہ لڑکی گلی میں داخل ہوتی، اینگلو انڈین منصف کی کھڑکیوں کے پردے گر جاتے اور پھر ان کے پیچھے نقرئی قہقہوں کی صدا گونج اٹھتی۔ سیٹھ جی کے مکان کا نچلی والا دروازہ کھٹ سے بند ہو جاتا اور گلی میں کھیلتے ہوئے بچے اندر کھینچ لئے جاتے، جیسے کوئی شیطانی روح اس گلی سے گذر رہی ہو یا کسی آسیب کے بجس سائے پھیل رہے ہوں مگر وہ لڑکی بت کی مانند تھی۔ خاموش، متین، شانت۔ جس میں کسی ماہر فنکار نے سانس کی آمد و رفت پیدا کر دی تھی۔ اُس کی سفید ساری پر جنگلی پھول کھلے رہتے تھے۔ اُس کے ہاتھ پر تین سُرخ چوڑیاں تھیں جو گھٹتے گھٹتے غائب ہو گئیں اور ایک روز اُس کے ننگے ہاتھ آنچل کو سنبھالے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں یہ لوگ اسے دیکھ کر چپ کیوں ہو جاتے تھے۔ مائیں اپنے بچوں کو اس کی نظر سے کیوں بچانا چاہتی تھیں اینگلو انڈین منصف کے مکان کے پردے کیوں گر جاتے تھے اور اُس کی پروٹیسٹنٹ لڑکی سارہ استہزائیہ قہقہے کیوں بلند کرتی تھی لیکن مجھ پر ایک سحر انگیز تاثر طاری ہوتا تھا۔ اور میری نگاہیں اس وقت تک اُس کا تعاقب کرتی رہتیں جب تک کہ وہ گلی کے اگلے موڑ پر اوجھل نہ ہو جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی نرم رو ندی پھولوں سے لدی چاند کی نورانی چادر اوڑھے بہہ رہی ہو۔ جب وہ لڑکی آتی تو دائیں طرف والے مکان کی بالائی منزل کی چلمن کے پیچھے ایک زندہ سایہ نمودار ہوتا اور دو پیاسی بھری نگاہیں اُس لڑکی کے قدموں کی چاپ کے ساتھ ساتھ حرکت کرتیں اور ایک لمحہ بعد ہی چوڑیوں کی کھنکناہٹ کے ساتھ ہی کسی اتھاہ تاریکی میں کھو جاتیں اس مکان کے رہنے والوں نے غلاظت اور گندگی کے مضر اثرات سے بچنے کے لئے گلی کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک پانچ فٹ اونچی دیوار استوار کر رکھی تھی۔ جو آہستہ آہستہ منہدم ہو رہی تھی، کئی جگہوں پر سوراخ اور دراڑیں بن گئیں تھیں۔ جن میں چھپکلیوں، مکڑیوں اور ننھے ننھے پرندوں نے اپنے گھر بنا رکھے تھے۔ کبھی کبھی کسی سوراخ سے کوئی سانپ بھی جھانک لیا کرتا تھا۔ کسی کسی جگہ اینٹیں بھی کھسک گئی تھیں اور جب ہوا کا تیز جھونکا آتا تو ان شگافوں سے عفونت کی ایک لہر مکان کے اندر پہنچ ہی جاتی تھی۔ شاید اس مکان کے رہنے والے بہت ہی پاک اور پرہیزگار واقع ہوئے تھے۔ وہ اپنی لڑکی کو گہرے سبز رنگ کی چادر میں لپیٹ کر اسکول بھیجتے تھے تاکہ بو اور دوسرے سیکڑوں مناظر سے اُن کی لڑکی کی نازک طبع پر بار نہ پڑے۔ یہ چادر تانگہ کے چاروں طرف اس طرح باندھ دی جاتی کہ چلتا ہوا تانگہ متحرک کیمپ

معلوم ہوتا تھا۔ یہ موٹی چادر بھی وقت کے ساتھ ساتھ گھس چکی تھی۔ ایک دو جگہ چھوٹے چھوٹے سوراخ بھی پیدا ہو گئے تھے جو آہستہ آہستہ بڑے ہوتے گئے۔ نیچے والے سوراخ سے ہمیشہ دو مخروطی انگلیاں نکلی رہا کرتی تھیں، اور پردے پر ایسی حرکت کرتی رہتیں جیسے کوئی ہارمونیم کے سروں پر کھیل رہا ہو۔ اوپر والے سوراخ سے روشنی کی دو کرنیں پھوٹنے لگتیں جو راہ گیروں کو کچھ فاصلہ تک اُن کے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیتیں۔ یہ لڑکی جان بوجھ کر گندگی کے مناظر سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ یا شاید شہر کی صاف کھلی ہوا سے مقید روح کو تازہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس کے والدین اُسے منتخب اشیا رسے بہلانا چاہتے تھے۔ انھوں نے سوراخوں پر رفو کروا دیا۔ اور پھیکے پڑے ہوئے سبز رنگ کو سیاہ کر دیا۔ زندگی کا چکر تانگہ کے پرانے پہیہ کی طرح گھومنے لگا۔ بس فرق اتنا ہی تھا کہ زندگی اپنے محور پر بے آواز گھوم رہی تھی اور پہیہ چلتے وقت اتنا شور مچاتا تھا کہ چھپکلیاں ڈر کے مارے سوراخ میں گھس جاتیں اور چڑیاں شیشم کی ٹہنیوں پر جا بیٹھتی تھیں۔ کبھی کبھی تیز ہوا سے چادر پھڑ پھڑانے لگتی۔ اور ایسا جان پڑتا کہ اگر یہ چادر خود بخود نہ ہٹائی گئی تو کسی روز بھک سے اڑ جائیگی اور اپنے ساتھ اس لڑکی کو بھی کسی نامعلوم دنیا میں لیجا پھینکے گی جو اس کی جانی پہچانی نہ ہوگی، جہاں وہ گم شدہ گائے کی مانند بھٹکا کریگی۔ اور کوئی پریزادہ اُس کے انتظار میں فقیروں کی قبا میں در بدر مارا مارا پھرتا ہوگا۔ لیکن یہ نہ ہوا، چادر کی تندیاں تنی رہیں۔ پہیئے بھیانک شور مچاتے ہوئے گھومتے رہے اور وہ یاس انگیز نگاہیں اُس لڑکی کو دیکھتی رہیں جسے سارہ دور سے ہی دیکھ کر قہقہے لگانا شروع کر دیتی۔

سارہ پہلے پہل اس راہ گیر لڑکی پر ہنستی نہیں تھی۔ بلکہ تحسین کی نظروں سے دیکھتی تھی۔ جب وہ پیانو بجاتے بجاتے تھک جاتی تو اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ پیانو کو چھت سے نیچے پھینک دے اور وہ خود اُس لڑکی کے دوش بدوش ہم سفر ہو جائے۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس کے ہونٹوں پر بھی مونالزا کا مقدس اور معصوم تبسم نمایاں ہو جائے، لیکن اُس لڑکی نے مونالزا کی مسکراہٹ چرالی تھی۔ وہ اپنے زیبائش اور سنگار کے تمام ساز و سامان کو پھینک دینا چاہتی تھی۔ حیات افروز زندہ تبسم کے لئے، لیکن دوسرے ہی لمحہ اُس کے ذہن میں کیف آگیں شام کا خیال انگڑائیاں لینے لگتا۔ بال روم کے پُر اسرار قمقموں کی روشنی میں شہزادوں اور پرویز کے رقص اور جوان سینوں کے لمس کا خوش کن احساس اُسے سرِ شام ہی وہاں پہنچا دیتا تھا۔ سارہ کبھی کبھی، اپنے چھوٹے سے لان میں آرام کرسی پر بیٹھی موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرتی اور بھوری بھوری آنکھوں والے خرگوش سے کھیلا کرتی۔ سارہ کو اب اُس لڑکی سے نفرت ہو گئی تھی۔ اور وہ اُسے دیکھ کر حقارت سے منہ پھیر لیتی تھی۔ شام کو فضل دین جب چراغ جلانے کے لئے آتا تو وہ کتاب میز پر رکھ کر آنکھیں بند کر کے کرسی کی بیک پر دراز ہو جاتی اور اُس کے سنہری بال زمین کو چومنے لگتے۔ وہ اُس وقت چونکتی جب بیوا اگی کی صفائی کر کے، اپنے میلے کچیلے بسورتے بچے کو اٹھائے سارہ کے سامنے آکھڑی ہوتی۔ سارہ انگڑائی لیکر اُس کی طرف دیکھتی اُس کے گلاب کی نازک پتیوں جیسے ہونٹ کھل اٹھتے اور اُس کے گالوں پر کنول مسکانے لگتے۔ اُس کی نیلی نیلی آنکھوں پر لمبی لمبی پلکیں اس طرح جھکی رہتیں جیسے کسی جھیل پر صنوبر کے سائے پڑ رہے ہوں ــــ دراز زلفیں اُس کے شانوں پر اس طرح پھیل جاتیں جیسے شالیمار پر غبار چھا جائے۔

سارہ بیوا کو ایک عجیب پوز میں بیٹھنے کے لئے کہتی، اور خود پیلٹ۔ رنگ۔ برش اور طشتریاں لینے کے لئے اندر دوڑ جاتی تو اُس کی کمر ناگ بیل کی طرح بل کھا جاتی۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ سارہ ایک لڑکی نہیں بلکہ کوئی جھونکا کھایا ہوا گلستاں ہے۔ بیوا سارہ کے کہنے کے بموجب اپنی کھلی ہوئی چھاتی سے چولی سرکا لیتی اور اپنے بچہ کا مونہ اپنی ننگی چھاتیوں پر رکھ دیتی۔ جیسے بچہ دودھ پی رہا ہو۔ وہ اپنے گرد آلود بالوں کو بکھرا کر زمین پر نظریں گاڑ دیتی۔ ایک ہاتھ سے اپنے بچہ کو سنبھالکر دوسرا ہاتھ زمین پر رکھ لیتی۔ جیسے وہ کسی بھاری بوجھ سے دبی جا رہی ہو۔ سارہ چٹکی بجا کر فائن کہتی اور تھوڑی دیر میں خاکہ مکمل کرنا شروع کر دیتی وہ ساتھ ہی ساتھ کہتی بھی جاتی: جب تمہاری تصویر اخباروں کے سرورق پر چھپے گی تو تمہیں انتہائی خوشی ہوگی، تمہاری شہرت دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائیگی، جانتی ہو تمہاری تصویر کا کیا نام ہوگا۔ "لائف وداؤٹ لائٹ" کتنا پر معنی نام ہے۔ کاش کہ تم اس کی گہرائیوں میں ڈوب سکتیں۔ سارہ یہ سوچ کر اداس ہو جاتی کہ بیوا بالکل جاہل ہے۔ وہ رنگ بھرتی بھرتی سوچنے لگتی کہ کب وہ وقت آئیگا جب بیوا بھی کیٹس اور شیلے کی رومانی نظموں کی دنیا میں مدغم ہو کر اپنے محبوب کی محبت کا جواب دے گی دوسرے ہی لمحہ اُسے شبہ ہو جاتا کہ یہ زمین پر رینگنے والے کیڑے بھی عشق کی لطافتوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ان کا کام تو بچے پیدا کرنا

اور مر جاتا ہے۔ پندرہ بیس منٹ تک یہی سلسلہ جاری رہتا اور پھر سارہ اُس کے سوتے ہوئے بچے کو پیپرمنٹ کی گولی دیکر رخصت کر دیتی لیکن بچہ اکڑی رہتی اور لجاجت آمیز لہجے میں شرماتے ہوئے اُسے پاپا سے سفارش کرنے کے لئے کہتی "نہیں نہیں تو مر جاؤں گی، پرماتما تمہارا بھلا کرے، تمہیں چاند سا بچہ دے۔" سارہ کو بچے کے نام سے ہی چڑ تھی۔ اس سے زندگی کا سارا رومان ختم ہو جاتا تھا اور وہ اس گالی کو بدترین قسم کی رجعت پسند گالی کہتی۔ بچہ کوئی جواب نہ پاکر سر جھکائے اپنے پلو سے آنسو پونچھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل جاتی۔

سارہ صرف مصوّرہ ہی نہ تھی بلکہ شاعرہ اور فلسفی بھی۔ وہ بڑے خطیبانہ انداز میں اس تقسیم کو بوسیدہ سماج کا عقیدہ بتلاتی تھی۔ جب یہ تقسیم ختم ہو جائیگی تو خوشی کے فوارہ پھوٹ پڑیں گے۔ جب شاہ بلوط کی شاخوں کے پیچھے چاند مسکرایا کریگا۔ اور بجلی کے قمقموں سے روشنی سڑکوں کے کناروں پر نئے بنگلوں سے پیانوں کی سحر انگیز سریلی موسیقی فضا میں تحلیل ہو کر ایک عجیب سماں باندھے گی اور وہ سٹوڈی بیکر میں اپنے محبوب کے پہلو میں بیٹھی "میری بلی" جا رہی ہوگی۔ جس کے باغ میں گہرے نیلے اور قرمزی پھول کھلے ہوں گے اور وہ اپنے محبوب کے سگرٹ کے دھوئیں، خوشبودار سانس اور آرکسٹرا کی دھن میں کیٹس کے مترنم رومانی اشعار پڑھا کریگی اور خوشی و مسرت سے سرشار ہو کر ناچا کرے گی آج بھی وہ پیکارڈ میں سفر کر سکتی تھی۔ لیکن اس کے لئے اسے راستہ بھر پیکارڈ کے مالک کی آغوش کو زینت بخشنی پڑتی تھی۔ آج بھی وہ آرکسٹرا کی لے پر جدید طرز کا رقص کر سکتی تھی لیکن اِس کے لئے اُسے اپنے پارٹنر کی بے ہنگم اور بے جوڑ باتیں گھنٹوں سننا پڑتی تھیں۔ اور ہر دعوت پر چھری کانٹوں سے کھیل کر اور کافی کا سرور حاصل کر کے اسے اپنے گالوں اور ہونٹوں کی سُرخی سے بے نیاز ہونا پڑتا تھا۔ اُسے ایسی زندگی سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی اس کا ایک محبوب ہو اور سیکڑوں پرستار۔ ایسی زندگی کتنی قابل رشک ہوگی۔ وہ یہ تجویز صرف اپنے لئے ہی چاہتی تھی۔ نہیں تو زندگی میں بیزار یکسانیت چھا جائیگی اور تمام رومان ختم ہو جائیں گے۔ سارے کمرہ میں بڑی بڑی خوبصورت جلدوں والی کتابیں تھیں جن کے نام زرّیں الفاظ میں رقم تھے۔ وہ گھنٹوں اپنے کمرے یا انڈیا کافی ہاؤس میں فلسفہ۔ زندگی۔ ادب۔ اشتراکیت اور نیو ہیومنزم پر بحثیں کیا کرتی۔ انگریزی فلموں پر تبصرہ اور تنقید اُسکا پسندیدہ مشغلہ تھا وہ انگریزی میں شاعری کرتی تھی جس میں فرانسیسی الفاظ بکثرت استعمال ہوتے تھے۔ اس کی نظمیں ملک کے مقتدر رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہو چکی تھیں۔ اُسے اس بات پر فخر تھا کہ وہ بعض انگریزی الفاظ کو بھی فرانسیسی لہجہ میں بولتی تھی۔ وہ کہا کرتی کہ انگلینڈ میں ایک زمانہ ایسا تھا کہ فرانسیسی جاننے والے امرا زیادہ مُہذب گنے جاتے تھے اور سوسائٹی میں اُنکی زیادہ عزت اور توقیر ہوتی تھی۔ وہ فرانسیسی سیکھنے کے لئے خاص طور پر پیرس کے ہوٹلوں اور قحبہ خانوں کا طواف کرتے تھے۔ انگلینڈ کی سوسائٹی گرلز انکے انتظار میں اپنی کئی شامیں ویران کر دیتی تھیں۔ کبھی کبھی سارہ کی شاعری میں سُرخ رنگ جھلکنے لگتا تھا۔ مصوّری میں اُسے سُرخ رنگ سب سے زیادہ مرغوب تھا۔ خون کی طرح گاتا۔ ناچتا۔ اُبلتا رنگ اُس کی تصویروں پر پھیلا رہتا تھا۔ لیکن جب اُس کی دوستی ایک امریکن سارجنٹ سے ہوئی یہ رنگ ہلکا ہوتے ہوتے گلابی پڑ گیا اور پھر بالکل نابود ہو گیا۔ ایک بار امریکن سارجنٹ نے اس کے سنہرے بالوں میں لگے ہوئے سُرخ پھول سے کھیلتے ہوئے اُس سے شکایت کی تھی کہ تمہاری شاعری اور مصوّری میں سُرخ رنگ بہت نمایاں ہے۔ مجھے اِس رنگ سے شدید نفرت ہے۔ سارہ نے مسکرا کر امریکن محبوب کی چھاتی پر سر رکھتے ہوئے کہا "ڈارلنگ۔ تمہیں میرے گلابی ہونٹ اور شفق کی طرح کھلتے ہوئے رخسار پسند ہیں" امریکن سارجنٹ نے اُس کے ہونٹوں کو چومتے ہوئے کہا "وہ بہت تم کتنی حسین ہو" ایک لمحہ بعد سارجنٹ نے سارہ کے طنز کو محسوس کیا۔ اس کے حلق میں کڑواہٹ پھیلنے لگی وہ جلدی جلدی گھونٹ نگلتے ہوئے بولا۔ "تم نیلی نیلی آنکھوں والی بلی کی مانند شریر ہو" سارجنٹ نے جھینپ مٹانے کے لئے کہا۔ لیکن کڑواہٹ کچھ تیز ہی تھی اور سارہ ہنس رہی تھی۔ سارہ سارجنٹ کو ناراض نہیں کر سکتی تھی۔ [illegible] کو اُس سے وابستہ کر رکھا تھا۔ اُسے سارجنٹ کے جذبات اور افکار کا لحاظ تھا۔ وہ اب نیلے رنگ کا [illegible] قصہ [illegible] نتیجہ [illegible] اس طرح جگمگانے لگے جیسے کوئی [illegible] کر سینکڑوں رنگ [illegible]

گی والی لڑکی پر قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ اُس نے ایک نظم لکھی۔ "ایک لڑکی" — اسی نام سے اُس نے ایک تصویر بھی بنائی۔ اس تصویر کو بنانے میں اُس نے شب و روز ایک کر دیا تھا۔ یہ تصویر اُس کا شاہکار تھی۔ ایک لڑکی سخت چٹان پر کھڑی اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ستاروں کی جھلک میں کھونے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔ شاید وہ اس سے بھی آگے اور جہاں میں جانا چاہتی ہے۔ لیکن اُس کے ہاتھ ہوا میں ہی معلق ہو کر رہ گئے۔ اُس کی نگاہیں خلاؤں میں کھو گئیں۔ چٹان کے نیچے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بہہ رہا تھا۔ لڑکی کی ذرا سی غفلت اُسے سمندر کی تہہ میں پہنچا سکتی تھی۔ اس تصویر پر اُسے نمائش میں انعام بھی ملا تھا۔ اُس کی پہلی تصویر نامکمل رہ گئی۔ جب دوسرے روز جبوا آئی تو اُس نے ایک روپیہ اُس کے ہاتھ میں دے کر رخصت کرتے ہوئے کہا "اب میں تمہاری تصویر خود ہی بنالوں گی"۔ جبوا نے روپیہ واپس کرتے ہوئے کہا۔ بی بی مجھے روپیہ نہیں چاہیئے۔ تمہارا جی خوش ہو جائے میری جھولی بھر جائیگی۔ ذرا پاپا سے میری سفارش کر دو۔ پاپا تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ سارہ روز روز کے اس احمقانہ اصرار سے تنگ آ چکی تھی۔ وہ یونہی اُداس بیٹھی رہی۔ کیونکہ اُس کا امریکن محبوب اپنے وطن واپس جا رہا تھا۔ وہ بھی اُس کی تھی امریکہ امریکن جانا چاہتی تھی وہاں وہ اُس کے ساتھ شادی کر کے اپنی زندگی گذارنا چاہتی تھی۔ لیکن سارجنٹ اُسے اپنے ساتھ نہ لیجا سکا۔ سارہ نے نہایت سنجیدگی اور بزرگانہ لہجہ میں بتایا "دیکھو جبوا! پاپا خود اس معاملہ میں بے بس ہیں۔ تمہارے باپ نے اس پر تمہیں اغوا کرنے کا دعویٰ کر رکھا ہے۔ جب تک یہ الزام جھوٹا ثابت نہیں ہو جاتا۔ اسے حوالات میں رہنا ہی پڑے گا۔ قانون کی حفاظت ہر شریف شہری کا فرض ہے"، سارہ یہ کہہ کر چلی گئی۔ جبوا نے اُس کے پاؤں پکڑنے چاہے لیکن وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ پیانو کی اُداسی لے میں اُس کی سسکیوں کی آواز گھل گئی تھی۔ فضا افسردہ ہو گئی۔ جبوا کچھ دیر خاموش رہی۔ اور پھر وہ پھاٹک سے نکل کر جھاڑو سنبھال کر ڈگمگاتے پاؤں سے واپس چلی گئی۔ وہ ہفتوں رات میں بیٹھ کر اپنی ننگی چھاتیوں کی نمائش کرتی رہی تھی۔ لیکن پھر بھی اپنے محبوب کو رہا نہ کرا سکی۔ اُسے سارہ پر بے حد غصہ آ رہا تھا وہ چاہتی تھی کہ اپنی تصویر کے پرزے پرزے کر کے نالی میں پھینک دے۔ اُسے یہ تصویر نہیں چاہیئے۔ وہ چاہتی تھی کہ سارہ کا گلا گھونٹ دے یا اُس کو سینٹ جارج چرچ کی بلندی سے نیچے گرا دے۔ لیکن وہ لاچار تھی۔ بے بس اور مجبور تھی۔ سارہ دوسری منزل سے اُس کی تصویر کو پھاڑ کر ہوا میں اڑا رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحہ سارہ اپنے کُشن کو آنسوؤں سے بھگو رہی تھی۔ اُس کی تمام اُمیدیں اور تمنائیں مندروں میں بجتے ہوئے ناقوس کی آواز کے ساتھ آسمان میں گم ہو گئیں۔ اتنے میں جمعدار جبوا کو گالیاں دیتا ہوا گلی میں پہنچ گیا "اس حرامی کو لے کہاں گھوم رہی ہو" ابھی تک میلا نہیں کمایا۔ جمعدار اپنی گرجدار آواز میں بولا "وہ صاف تو کر چکی ہوں" جبوا نے آواز میں درشتی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ آج وہ لڑنے پر آمادہ تھی۔ آج سے پہلے وہ جمعدار کی گالیاں سر جھکائے سن لیا کرتی تھی۔ "اور یہ کیا ہے تمہارا" جمعدار نے مٹی کے چھوٹے سے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گالی دی۔ "جمعدار" جبوا کی نگاہیں سلگ اُٹھیں اور جھاڑو پر اس کے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ "چالان کرنا ہے تو کر لو۔ گالی مت بکو" اس گلی کے لوگ ہی گندے ہیں۔ ادھر صاف کرو اُدھر پھر کوڑا"، جبوا نے جھاڑو اٹھائی اور چلنے لگی۔ جمعدار جبوا کی سخت کلامی سے چونک پڑا۔ اُس نے زبان میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا "یہ مت کرو۔ خواہ مخواہ اس نکھٹو کے لئے اپنی جوانی پر ظلم ڈھا رہی ہو"۔ جمعدار کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ لیکن وہ اُسے جھاڑو سے دھکیلتی ہوئی آگے نکل گئی۔ جمعدار کہہ رہا تھا، "سالی دیکھ لینا۔ جو اُس بدمعاش کو سات سال چکی نہ پسوائی تو اپنے باپ کا نہ کہنا"۔

تیرگی بڑھ رہی تھی اور گلی کا منظر بھیانک ہو رہا تھا۔ زرد زرد چاند سارہ کے مکان کے پیچھے جھانکنے لگا اور مجھے یاد آیا کہ سیٹھ جی کے گھر جانے میں دیر ہو گئی ہے فضل دین کے آتے ہی مجھے سیٹھ جی کے گھر جانا پڑتا تھا۔ جہاں متواتر دو گھنٹے اُنکی دوسری بیوی سرسوتی کی کور ذہنی کا بار اُٹھانا پڑتا۔ سیٹھ جی روئی کے مشہور متمول سوداگر تھے۔ علم و ادب سے کوئی شغف نہ رکھتے تھے۔ اُنکی عمر پچاس کے لگ بھگ

تھی۔ وہ شب و روز اسی غم میں مبتلا رہتے تھے کہ کسی طرح اُن کے دو لڑکے ہو جائیں تو روئی کا تمام کاروبار سنبھال لیں۔ آخر منیجروں پر کب تک بھروسہ کیا جائیگا۔ بدقسمتی سے انکی پہلی شادی سے صرف لڑکیاں ہی پیدا ہو رہی تھیں۔ انکی پہلی بیوی کی عمر بھی پینتیس سے تجاوز کر چکی تھی۔ جو شخص بنا اولاد نرینہ کے مر جائے اُسے دوزخ کی آگ میں سلگنا پڑتا ہے۔ سیٹھ جی دھرم کرم کے پورے پابند تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ روز صبح ایک سادھو کو کھانا کھلانے کے بعد بھی جنت کے حقدار نہ بنیں۔ اس لئے انھوں نے دوسری شادی کر لی۔ سیٹھ جی کی قسمت جاگ اُٹھی۔ ان کے یہاں گول مول گورا سا لڑکا پیدا ہوا۔ سیٹھ جی دُبلے پتلے اور سیاہ فام تھے۔ یہ خوبصورت سا بچہ پا کر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ اب وہ بھگوان سے یہی پرارتھنا کرتے رہتے تھے کہ ایک لڑکا اور ہو جائے تو وہ کسی بن میں کٹیا بنا کر تپسوی ہو جائیں اور بھگوان کے بھجن میں اپنا ہیرا جنم سپھل بنا لیں۔ سرسوتی ہندی کا ودیا ونودنی کا امتحان اچھے نمبروں پر پاس کر چکی تھی اور اردو بھی تھوڑی بہت شُد بُد رکھتی تھی۔ وہ بیک وقت دو رسالوں "اپسرا" اور "حور" کی ادارت کرتی تھی۔ میرا کام اس کے ہندی کے نگارشات کی نوک پلک درست کر کے اردو میں ترجمہ کر دینا اور ادارتی نوٹ تحریر کرنا تھا۔ دونوں رسالے عشق و محبت کے ہیجان انگیز قصوں۔ جذباتی نظموں اور زیبائش اور آرائش کے جدید فیشن کے تذکروں کی بنا پر ملک بھر میں ہر دلعزیز ہو چکے تھے۔ اسکول کی لڑکیوں کے پسندیدہ رسائل تھے اور صوبہ کی حکومت نے لڑکیوں کے اسکولوں کے لئے منظور کئے تھے کیونکہ ان سے لڑکیوں میں غیر ملکی خطرناک رجحانات پیدا ہونیکا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ کھاتے پیتے گھرانوں کی عورتیں بھی ان رسائل سے ہاضمہ کی دوا کا کام لیتی تھیں اور رجسٹرڈ نمبر سے لے کر آخری اشتہار تک بھی پڑھ لیتی تھیں جس میں ایک چھوٹی سی شیشی سے ننھے ننھے بچے بھاپ کی طرح نکل رہے تھے۔ رسالہ کی اشاعت کو بڑھانے کے لئے ہم نے خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری کر رکھا تھا۔ جو کافی مقبول ہوا۔ اسی سلسلہ میں دل دھڑکنے نیند نہ آنے اور بازار میں خرید و فروخت تک ہر سوال کا جواب دیا جاتا تھا۔ اس تمام کام کے لئے مجھے ساٹھ روپے ماہانہ ملتے تھے اور کام بھی تھا کہ جو جی میں آئے لکھو۔ مجھے اس گلی میں آئے ہوئے چھ مہینے گذر گئے اور اسی روز سے ان دو کثیر الاشاعت رسالوں میں کام کر رہا ہوں۔ ان رسالوں کی تعریف میں ہمیں سینکڑوں خطوط مل چکے ہیں جس سے ہماری حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ اور ہم پہلے سے زیادہ رنگین بنانے کی کوشش کرتے۔ بعض اوقات اسکول کی لڑکیاں ایسے عجیب غریب سوالات پوچھ بیٹھتیں کہ میں خوف سے کانپ جاتا۔ گو میں نے اپنے اصلی نام سے کوئی بھی چیز تحریر نہیں کی۔ لیکن کبھی کبھی تنہائی کے لمحوں میں میری خوابیدہ روح بیدار ہو کر مجھے جھنجوڑنے لگتی — جو بار بار چاندی کی تیلیوں کے پیچھے چلا چلا کر خاموش ہو جاتی تھی۔ جب میں رات کو کبھی کبھی ڈراؤنے خواب سے چونک پڑتا تو گلی کے لمپ کی روشنی کی وجہ سے کمرہ کی کھڑکی کی سلاخوں کے سایے سامنے دیوار پر پڑتے اور میرا سر دیوار سے اس طرح لگا ہوتا جیسے کوئی قیدی سلاخوں کو توڑ کر رہائی پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے تھک کر سلاخوں سے سر ٹکرا کر سو گیا ہو۔ مجھے اپنا جسم۔ اپنی روح اور اپنے افکار سب ایک تاریک قید خانے میں جکڑے ہوئے نظر آتے۔ گلی میں لمبے لمبے متحرک سایے نمودار ہوتے اور غائب ہو جاتے چند روز سے مجھے اپنے اندر ایک طوائف انگڑائیاں لیتی نظر آنے لگی۔ میرے چہرہ پر غازہ اور سُرخی کی تہیں اُبھرنے لگیں۔ طوائف اپنی جمال آرائی اور ناز و غمزہ کے ذریعہ لوگوں کو اپنے فن کا گرویدہ بناتی ہے۔ اور میں تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعہ اپنے افسانوں میں رنگ بھرتا ہوں جیسے لوگ چھپ چھپ کر پڑھیں اور سینے سے لگائیں آخر طوائف کا مصرف ہی کیا ہے، اس میں اور مجھ میں فرق ہی کیا ہے جس طرح وہ اپنے بے جوڑ ناموں کو بدل کر رومانی نام رکھ لیتی ہے۔ میں نے اپنا اصلی نام چھوڑ کر پُرکشش نام سے لکھنا شروع کر دیا ہے۔ طوائف اپنا جسم اپنے حُسن کی شکل میں ہوس کاروں کے سامنے نیلام کرتی ہے اور میں اپنی روح اپنے افسانوں میں رنگ کے خریداروں کو پیش کرتا ہوں۔ اس کی کافر ادائیں میرے افسانوں کی ہیجان انگیز کیفیتیں بن جاتی ہیں۔ دونوں کا مقصد خریداروں کی جیب سے چاندی کی ٹکلیاں نکالنا ہے۔ لیکن طوائف کبھی کبھی خلوت میں اپنے پاکیزہ کپڑوں میں ملبوس ہو کر

صاف شفاف بستر پر لیٹ کر ابدی مسرت محسوس کرتی ہے۔ اس تنہائی کا ایک لمحہ اس کی دن بھر کی تھکن کو دور کر دیتا ہے۔ اس ایک لمحہ کی قیمت اس کی تمام عمر کی کمائی کے سامنے ہیچ ہے۔ اس طرح تنہائی کے لمحوں میں اپنے اصلی نام سے افسانے لکھتا ہوں جس کو پڑھ کر بعض شریف الطبع لوگوں کی اخلاقی حس کو ٹھیس پہنچتی ہے اور سرکاری رسالوں میں مضمون لکھ لکھ کر کوستے ہیں لیکن میں انھیں تحریروں سے نشاط کی کلیاں چن کر اپنی تیرہ و سنسان راتوں میں حظ حاصل کرتا ہوں۔ وہ افسانے جو "اپسرا" اور "حور" کے لئے لکھتا ہوں میرے سینے پر کالے ناگ کی طرح پھن اٹھائے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ احساس مجھے کئی روز سے پریشان کئے ہوئے ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جس طرح سماج کی پروردہ طوائف کئی نسلوں میں گناہ و عفونت کا انجکشن کر رہی ہے۔ اسی طرح میں بھی کئی نسلوں میں زہر ہلاہل سرایت کر رہا ہوں۔ جو کئی شاداب گودوں کو ویران کر دیگا۔ کئی فنکاروں کو ہوس کے دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیگا اور سینکڑوں کو ندیوں اور دریاؤں کی آغوش میں اپنا ناموس بچانے کے لئے موت کی ابدی نیند سلا دیگا اور میں لعنت بھیجتا ہوں۔ اپنے آپ پر۔ اپنی جرات اور اپنے حوصلہ پر جو مصائب کا مقابلہ کرنے سے جھجکتے ہیں لیکن اگلے ہی لمحہ مستقبل کے تاریک سائے روشن ضمیر کو بھی گہنا دیتے ہیں۔ اور میں سو جاتا ہوں۔ میرا ضمیر سو جاتا ہے۔ میری روح سو جاتی ہے کبھی کبھی چونک جانے کے لئے۔ اور پھر میں اپنے آپ کو سلاخوں سے ٹکرا ٹکرا کر لہولہان کر لیتا ہوں۔ مجبور ہو کر تڑپ کر اور رو کر نیند کی دیوی کی گھنیری چھاؤں تلے ہتھیار ڈال دیتا ہوں۔

آج اتوار ہے اور ہر اتوار کو مجھے وقت مقررہ سے ایک گھنٹہ پیشتر جانا پڑتا ہے۔ لیکن آج دیر ہو گئی تھی۔ میں نے کپڑے پہنے اور سیٹھ جی کے گھر پہنچ گیا۔ سیٹھ جی ہر اتوار کو اپنے دوست بدری چند کے ہاں حساب کتاب چکانے چلے جاتے تھے اور دوست کے اصرار پر وہیں سو جاتے تھے۔ شنلے روڈ پر واقع سیٹھ جی کا دو منزلہ مکان رات کو بہت ہی خوبصورت دکھائی دیتا تھا جب ریشمی پردوں سے روشنی کی کرنیں چھن چھن کر کولتار کی سڑک پر پڑتی تھیں تو سڑک جگمگا اٹھتی تھی۔ اس مکان میں پہنچ کر میں ایک لحظہ کے لئے اپنی پیاری گلی کو بھول جاتا ہوں۔ جس میں چلتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے جہنم کی راہ پر چل رہا ہوں یا خون اور پیپ کے چڑھے ہوئے دریاؤں میں تیر رہا ہوں۔ میرے دیر سے جانے پر سرسوتی نے باز پرس کی۔ میں نے اپنی پریشانی اور ذہنی الجھنوں کے اسباب بتانے شروع کر دیئے تو وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ ادب تفریح طبع کے لئے پیدا ہوا ہے۔ جذبات و خواہشات میں ہلچل پیدا کرنے کے لئے۔ ادیب واعظ نہیں۔ اگر اخلاقی اسباق ہی لینے ہوں تو مندروں اور مسجدوں کی سجدہ نوائی کیجئے۔ میرا دماغ آج سراسر بغاوت پر آمادہ ہو چکا تھا۔ اور میں پنسل لئے ہوئے ٹیبل پر جھکا رہا اور سرسوتی اپنی معرکہ آرا نظم سناتی رہی۔ چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی کرنیں...... ہم دونوں ایک...... گھڑی نے دس بجائے اور اس کی آنکھوں میں نیند جھانکنے لگی۔ اس نے خمار آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور سوئی ہوئی انگڑائی لے کر مجھے رخصت کر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ پرچہ شائع کروا کے مستقل رخصت لے لوں۔ اس لئے زیادہ دیر تک کام کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ مجھے چھٹی دینے پر بضد تھی۔ کتنی رحمدل عورت ہے دیر سے آنے پر بھی مقررہ وقت پر چھٹی دے دی اور شاید اس بار تنخواہ بھی کٹنے نہ دے۔ میں اس کی تمام کڑوی باتوں کو بھول گیا اور چلا آیا۔ شنلے روڈ جاگ رہی تھی۔ آسمان پر تاروں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ میں اپنے ویران کمرے کے تصور سے ہی آزردہ و افسردہ ہو گیا۔ اور آج تو مٹی کا تیل بھی ختم ہو چکا تھا۔ میں بے اختیار کرسچین سیمٹری کی طرف روانہ ہو گیا۔ آج کئی مہینوں بعد میں یہاں آیا تھا۔ سیمٹری کی پرسکون خاموش فضا میں آلام زدہ روح کو تسکین ملتی تھی۔ قبرستان میں سینکڑوں نئی اور پرانی قبریں تھیں۔ جن پر مرنے والوں کے رشتہ داروں نے دوستوں نے انکی روح کی راحت کے لئے محبت بھرے الفاظ میں اپنے غم کا اظہار کیا تھا۔ پرانی قبروں پر مرجھائے ہوئے پھولوں اور پتوں کی بنی ہوئی صلیبیں پڑی تھیں۔ بعض قبریں خوبصورت تھیں بعض ٹوٹی ہوئی۔ اور بعض میں صرف مٹی کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ قبروں کا جائزہ لیکر مرنے والوں کی سماجی حیثیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا

قبرستان کے ایک فرلانگ کے فاصلے پر نرم رو گنگا بہہ رہی تھی۔ چاند کی کرنیں گنگا کی ہلکی ہلکی لہروں پر رقص کر رہی تھیں ان راتوں میں یہ منظر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ساری کائنات موت کی نیند سو رہی ہو۔ میں قبرستان کی دیوار پر خاموش بیٹھا رہا۔ میرے سوا وہاں کوئی زندہ آدمی نہ تھا۔ مجھے توقع تھی کہ اینگلو انڈین منصف اپنی پیاری ماں کی قبر پر پھول چڑھانے کے لئے ضرور تشریف لائیں گے انہیں اپنی ماں سے بہت محبت تھی اور وہ ہر اتوار کو سر شام ہی قبرستان کی طرف پیدل روانہ ہو جاتے اور رات وہیں دعاؤں میں گزار دیتے آج بھی وہ گھر سے اسی ارادہ سے نکلے تھے۔ نامعلوم ابھی تک یہاں کیوں نہیں پہنچے۔ قبرستان میں صرف کلاک کی آواز ہی ہر آدھ گھنٹے بعد اس کے اتھاہ سکوت کو توڑ دیتی تھی۔ میں کئی گھنٹے بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ میرے ذہن میں کوئی خیال نہیں تھا۔ میں بھول گیا تھا کہ قبرستان میں رات کو بھوت ناچا کرتے ہیں۔ اتنے میں قبرستان کی خاموشی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کرتی سسکیوں کی آواز آنے لگی۔ چند قدم پر تاڑ کے درخت کے نیچے کوئی سانولی لڑکی پھولوں کی نازک پتیاں لئے ہوئے دوزانو بیٹھی تھی۔ میں ایک لحظہ کے لئے اسے دیکھتا رہا چند درختوں کے پتوں کے پیچھے اس کے چہرہ پر سایہ ڈال رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے رخسار پر شبنم موتیوں کی طرح چمک رہی تھی۔ درختوں کے خشک پتوں پر میرے قدموں نے ہلکی سی آواز پیدا کر دی اور وہ چونک پڑی۔ اس کی آنکھوں میں ہراس کی ہلکی سی لہر اٹھی جو دوسرے ہی لمحہ کرب کی گہری لہر میں ڈوب گئی۔ میں نے عالم بے اختیاری میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ رو رہی تھی۔ ہمدردی کے چند جملے سن کر اس کا سوز جاگ اٹھا اور وہ کہنے لگی۔

"میں رہتا ہوں۔ رہتا۔ میں ایک غریب نرس ہوں۔ ماں باپ کی شفقت سے محروم۔ میں اس دنیا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ اتنا بھی نہیں جتنا کہ میری ہم عمر دوسری نرسیں جانتی ہیں۔ میں تاریکیوں میں پلی اور بڑھی۔ اور جب بڑی ہوئی تو تنہائیاں مجھ کاٹنے کو دوڑتی تھیں۔ میں اپنی کئی راتیں اسی قبرستان میں اپنی پیاری ماں کی قبر پر سر رکھ کر گزار دیتی تھی۔ ایک روز ایسی ہی چاندنی رات میں جب گرجے کے کلاک نے بارہ بجائے میں یہاں آئی۔ گنگا ایسے ہی آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ اور فضا ایسے ہی پرسکون تھی۔ میں نے اپنی ماں کی قبر کے پاس سفید کپڑے میں لپٹا ہوا ننھا سا چاند کا ٹکڑا پایا۔ میری امیدوں کا مزار۔ اور میری تمناؤں کا گہوارہ۔ میری تنہائیوں کا ساتھی اور میرے دکھوں کا غمخوار۔ جسے میں نے اپنے خون سے پالا۔ اور اپنی کنواری چھاتیوں پر جس کی پرورش کی۔ آج اس قبر میں سو رہا ہے۔ لوگوں نے مجھ پر تہمتیں لگائیں۔ الزام تراشے۔ قہقہے لگائے اور طعن و تشنیع سے میرے دل کو چھلنی کیا۔ لیکن میں نے اس معصوم بچے کی خاطر سب کچھ برداشت کیا۔ ایک روز وہ بیمار ہو گیا۔ میں ایک مریض کی تیمار داری میں مشغول تھی۔ جو موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ میرے پاس اتنی رقم نہ تھی کہ اپنے بچے کی نگہداشت کے لئے کوئی ملازم رکھ چھوڑ جاتی۔ مریض کا آپریشن ہونا تھا آپریشن ناکام ہوا اور وہ مر گیا۔ میں گھر پہنچی۔ میرے ننھے کا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میرے گالوں کی گرمی اور میرے ہونٹوں کی تپش بھی اس کی لاش میں حرکت پیدا نہ کر سکی۔ مجھ سے میری زندگی چھین لی گئی ...... یہ اس کی قبر ہے ......" لڑکی جذبات بھری آواز میں کہے جا رہی تھی "وہ اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کا لمس میری بیزار زندگی میں ایک برقی لہر دوڑا دیتا تھا۔ اس کی تتلائی ہوئی بولی مجھے پادری کے وعظ اور بائبل کے الفاظ سے زیادہ شیریں اور مقدس معلوم ہوتی تھی۔ لیکن میں اسے نہ بچا سکی کیونکہ میں اس شخص کی زندگی بچانے میں معروف تھی۔ جس کی فیس سے میں ننھے کا علاج کرتی .... میرے چاروں طرف اب تاریکی ہی تاریکی ہے۔ میں تنہا رہ گئی۔ میری شمع بجھ چکی ہے۔ جو مجھے کٹھن راہوں میں بھی روشنی دیتی تھی ......" سانولی لڑکی میرا ہاتھ تھام کر رونے لگی۔ وہ مجھے مریم کی مانند نظر آنے لگی۔ اس کے گرم گرم آنسو میرے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔ اور وہ دیوانہ وار روئے جا رہی تھی۔ چاند سیاہ بادل کے ٹکڑے میں چھپ گیا۔ تمام ماحول پر تاریکی اور پر ہول سکون مسلط ہو گیا۔ میرا دل بھر آیا لیکن میں رو نہیں سکتا۔ میرے آنسو سالوں ہوئے خشک ہو چکے تھے۔ میں اس سے ہمدردی نہیں کر سکتا تھا۔ میرا کلیجہ ان داستانوں کو سنتے سنتے پتھر بن چکا تھا۔ لیکن میں اس معصوم لڑکی کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن میں اس کا غمزدہ چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

نا معلوم کب وہ لڑکی میرا ہاتھ چھوڑ کر چلی گئی۔ دور گنگا میں ارتعاش پیدا ہوئی۔ چاند سیاہ بادل کے ٹکڑے سے باہر نکل آیا۔ گنگا میں ایک سیاہ گول نمودار ہوا جو کلنک کا ٹیکہ بن کر چاند کے سفید چہرے پر ثبت ہوگیا۔ قبر پر پھول کی پتیاں بکھری پڑی تھیں شاید مرنے والے بچے کے لئے اس لڑکی کا آخری تحفہ تھا۔ اُس کے دل کی مانند نرم اور خوبصورت۔ اُس کے بچے کی مانند پیارا پیارا سا میں نے قبر پر جھک کر ان نازک پتیوں کو چوم لیا۔

شاید ریتا ڈوب چکی تھی۔ وہ اپنے معصوم بچّے سے ملنے کے لئے سب کچھ کر سکتی تھی۔ میں اداس اور شرمسار قبرستان سے واپس لوٹ آیا۔ راستہ بھر مجھے سڑکوں پر ڈراؤنے بھوت ناچتے نظر آتے۔ اور میں سردی میں کانپتا رہا۔ سڑک کی بجلیوں کے سوائے تمام روشنی بجھ چکی تھی۔ مکانوں کے اندر بالکل اندھیرا تھا فٹ پاتھوں پر سوئے ہوئے انسان دھرتی پر اُبھرے ہوئے پھوڑوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ جب میں گلی میں مڑا تو ایک سایہ سیٹھ جی کے گھر سے نمودار ہوا۔ سایہ لمبا ہوتا گیا چراغ کی روشنی میں وہ سایہ اینگلو انڈین منصف بن گیا۔ سایہ موڑ پر غائب ہوگیا۔ مجھے پہلی بار اس بیمار چراغ کی اہمیت کا اندازہ ہوا اس کے ساتھ ہی بوڑھے فضل دین کی خدمات بھی یاد آگئیں۔ لُو کی ایک تیز لپٹ نے مجھے ناک پر رومال رکھنے کے لئے مجبور کر دیا۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اونچے ہوتے ہوتے پہاڑ بن رہے تھے۔ نالیوں کا گندہ پانی زہر کا دریا بن کر تیزی سے بہہ رہا تھا چمگادڑ اسی بے قراری کے عالم میں چکر کاٹ رہی تھی اور چھپکلیوں کی آواز عجیب شور پیدا کر رہی تھی۔ کاش کہ چاند کی چاندنی اس تاریک گلی کو دھو دے اس پر ستاروں کی ردا کی جھالر چڑھ جائے۔ لیکن یہاں مکمل اندھیرا تھا۔ میں اپنے اُجڑے دیار میں داخل ہوا اور لیٹ گیا۔ عجیب بھیانک خوابوں نے نیند حرام کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کمرے کی دیواریں ایک دوسرے کی نزدیک آتی جا رہی ہیں اور میں ان میں پسا جا رہا ہوں۔ میرے اوپر چھت گر رہی ہے۔ دیواریں لرز رہی ہیں اور آن کی آن میں یہ ڈھانچہ چٹاخ کر کے ٹوٹ جائیگا۔ چراغ کی لو ہوا کے تیز جھونکوں میں ٹمٹا رہی تھی۔

دوسرے روز فضل دین چراغ جلانے کے لئے آیا۔ سانولی لڑکی آج خلاف معمول تیز تیز آئی اور گذر گئی۔ اس کے چہرہ کے نقوش میں اور ریتا کے چہرے میں بے حد مماثلت پائی جاتی تھی۔ اتنی گہری مشابہت میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ لیکن ریتا کی آنکھوں میں مظلومیت اور بے چارگی پھیلی ہوئی تھی اور یہ لڑکی اپنے غم کے باوجود تیقّن اور جرات کا دامن تھامے ہوئے تھی۔ یہ لڑکی ریتا کا بدلا ہوا روپ تھی۔ آج سارو نے قہقہے بھی نہیں لگائے۔ وہ اُداس سی اپنے ہاتھوں سے چہرہ تھامے لان پر بیٹھی تھی۔ میں سیٹھ جی کے مکان میں چلا گیا۔ سیٹھ جی اپنے کمرے میں مے نوشی کر رہے تھے کیونکہ اینگلو انڈین منصف نے انھیں چور بازاری کے ایک مقدمہ میں بری الذمہ قرار دے دیا تھا۔ سرسوتی خوش خوش نظر آتی تھی۔ میں ملازمت چھوڑنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ ریتا نازک سی اور کمزور دل لڑکی اگر طوفان کے مقابلہ میں کھڑی ہو سکتی ہے اور یہ سانولی لڑکی استہزائیہ قہقہوں کے باوجود اپنے مقصد کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہے تو میں ایک افسانہ نگار... سماج کا حساس ترین فرد اس رزم کا خاموش تماشائی نہیں بن سکتا۔

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی ملازمت چھوڑنے کا ارادہ ظاہر کر دیا۔ سرسوتی کے چہرے پر تشکیک کے آثار نمودار ہوئے۔ اُس نے طنزیہ مسکراہٹ سے میرے خیالوں کا مضحکہ اڑایا۔ اور جب میں نے اپنے خیالوں کی وضاحت کی تو وہ چونک پڑی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے کثیرالاشاعت نسوانی رسالے بند ہو جائیں گے جن میں اس کی نظمیں چھپا کرتی ہیں۔ وہ میری ذہنی محنت کی خریدار تھی۔ میں نے اس کے دل کے چور کو عیاں کر دیا۔ اس کے کمرے میں ہالی وڈ کے ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی نیم عریاں تصاویر مسکرا رہی تھیں۔ عطر میں بسے ہوئے چکا چوند کمرے میں میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ سرسوتی نے معاملہ پر بڑی سنجیدگی سے غور کیا وہ کہنے لگی تم پر اس ناہنجار لڑکی کے نجس سائے پڑ گئے ہیں۔ معلوم نہیں وہ لڑکی کتنے لوگوں کو بہکا چکی ہے۔ سرسوتی نے

دھمکی اور لالچ سے کام لیا لیکن باغی ذہن فرسودہ پنجرے میں دوبارہ مقید ہونے سے انکار کر رہا تھا۔ سرسوتی یک لخت چارپائی پر گر پڑی اور اُس نے چیخنا شروع کر دیا۔ میں نے سمجھا اُسے دورہ پڑ گیا ہے۔ کیونکہ اُسے عموماً ایسے دورے پڑا کرتے ہیں اور وہ اِسی طرح بھیانک چیخیں نکالتی تھی۔ جونہی میں اُسے سنبھالنے کے لئے اُس پر جھکا کمرہ میں سیٹھ جی اور اُن کا نوکر داخل ہوئے میں نے بات کرنے کے لئے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ سرسوتی نے روتے روتے سیٹھ جی سے کہنا شروع کر دیا کہ اس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالنا چاہا۔ اگر آپ وقت نہ آ جاتے تو......... "اُس نے سیٹھ جی کی اندر دھنسی ہوئی چھاتی پر اپنا سر رکھ دیا اور اپنے آنچل سے آنسو پونچھنے لگی جو بہہ نہیں رہے تھے۔ سیٹھ جی غصّے سے بے قابو ہو رہے تھے۔ شراب کے نشے میں چور وہ کانپ رہے تھے۔ شراب کی بُو کے بھبوکے اُن کے مُنہ سے نکل رہے تھے۔ میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا لیکن میری آواز سیٹھ جی کی گالیوں اور سرسوتی کی مصنوعی سسکیوں میں ڈوب گئی۔ سیٹھ جی نے اینگلو انڈین منصف کو بُلا بھیجا۔ منصف گھبرائے ہوئے آئے۔ لیکن سرسوتی نے مستور مسکراہٹ سے اُن کے منہ میں زبان دے دی۔ اُنھوں نے معاملہ کی نزاکت پر غور کرتے ہوئے بڑے مُدبّرانہ لہجے میں فرمایا کہ ایسے اوباش آدمیوں سے محلّے کی اخلاقی حالت پر بہت بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ محلّے والوں کی بہو بیٹیوں کی عزت کا معاملہ ہے یہ درحقیقت سب کی عزت کا سوال تھا۔ اِس لئے سب کی مشترکہ تجویز کے مطابق مجھے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر کمرہ خالی کر دینے کا حکم مل گیا۔ اور اس کی خلاف ورزی کرنے پر مجھے ہوا کے محبوب کے ساتھ کبھی تاریک کھٹمل زدہ کوٹھری میں زندگی کا کچھ حصّہ گذارنا پڑے گا۔ گو اب بھی میں وہاں رہتا ہوں جو اِس اندھیری کوٹھری سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ میں چُپ چاپ باہر چلا آیا۔ مجھے کوئی غم نہیں تھا۔ کوئی خوشی نہیں تھی۔ کوئی احساس نہیں تھا۔ میرا چہرہ بھی راہ گیر لڑکی کے چہرے کی مانند ہر قسم کے جذبات سے خالی تھا۔ میں کچھ سوچ نہیں رہا تھا۔ کچھ محسوس نہیں کر رہا تھا۔

بیس گھنٹے گذر چکے تھے۔ سینٹ جارج چرچ کے کلاک نے چھ بجائے، اور بوڑھا فضل دین چراغ جلانے کے لئے آ گیا۔ اینگلو انڈین منصف میری طرف سنسنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر ٹینس کھیلنے کے لئے چلے گئے۔ ہوا کی چیخیں محلّے کے پُرسکون امن میں خلل ڈال رہی تھیں۔ اُس نے اینگلو انڈین منصف کے پاؤں پکڑنے چاہے۔ لیکن اُس کے ہاتھ پہلے ہی رہ گئے اور منصف اپنی کار پر کلب چلا گیا۔ ہوا جیل کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر واپس لوٹ آئی تھی کیونکہ اس کا محبوب ان بلند و بالا دیواروں سے باہر نہیں جھانک سکتا تھا۔ سارہ اپنے لان میں بیٹھی اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی "دور آسمان پر شفق کی سُرخی پھیل رہی تھی جب جہاز نے ساحل کو چھوڑا۔ اور میں اُس وقت ننھے ننھے ستاروں والے پرچم کو دیکھتی رہی جو ایک شان دلربائی سے جہاز کے ستونوں پر لہرا رہا تھا۔ حتّٰی کہ وہ دھندلکوں میں گُم ہو گیا" میں چاہتا تھا کہ سارہ قہقہے لگائے لیکن وہ خاموش تھی اور کسی فلم کمپنی میں ہیروئین بننے کے لئے سوچ رہی تھی۔ دائیں مکان والی لڑکی اُسی اکّے میں بیٹھے بیٹھے بمبئی ٹورِیم میں جا رہی تھی۔ کب تک اُس کے والدین ایک جواں زندہ لاش کو اپنے سینے سے چمٹائے رکھیں گے۔ آج اُس کے گرد سبز رنگ کی دیوار نہیں تھی۔ اُس کی بے نور آنکھیں خلاؤں میں جھانک رہی تھیں۔ اس کے زرد چہرے پر ہونٹ سیاہی مائل ہو گئے تھے۔ جیسے کہ کبھی مارِ سیاہ نے ڈس لیا ہو۔ وہ چمکدار ہیرے کی مانند تھی جو جل کر خاکستر ہو گیا ہے۔ آج ہیرے کو کسی تجوری میں چھپا رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ کسی چور کا خطرہ نہ تھا۔ کیونکہ ہیرا تو راکھ ہو چکا تھا۔ فضا میں اس کے والدین کی آواز گونج رہی تھی۔ ثریا... ثریا... لیکن ثریا ستاروں کی محفل سے ٹوٹ کر اتھاہ تاریکیوں میں ڈوب چکی تھی۔ پھر کبھی نہ اُبھرنے کے لئے۔

فضل دین نے چراغ جلاتے ہوئے میرے جانے پر رنج کا اظہار کیا۔ جب میں نے اُسے اپنے جانے کی خبر سُنائی۔ اور کہا کہ شریف آدمیوں کے محلے میں لفنگے نہیں رہ سکتے تو بوڑھے کے ہاتھ سے چمنی چھوٹ کر زمین پر گر گئی اور چور چور ہو گئی۔ اُس کے

(باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

مار گیا

انور عظیم

سلاخوں کے پیچھے

سات نمبر سل، سنٹرل جیل
۳۱ اکتوبر سنہ ۴۸ء

سوچ رہا ہوں کیسے شروع کروں، جو کچھ میں لکھنا چاہتا ہوں، اس میں کوئی لطافت نہیں، کوئی وجدانی حسن نہیں، کوئی خمار آگیں شعریت نہیں، گاتی ہوئی بہاروں کی بہک نہیں۔ فضا میں ستاروں کا رقص ہے نہ روشِ پر دشمنِ ایماں وآگہی کا خرامِ ناز۔ اگر میں نظر کشی کروں تو آپ کی نگاہیں زنجیروں میں جکڑ کر رہ جائیں گی۔ یہاں ہر چیز زنجیر پہنے ہوئے ہے کوئی چیز آزاد نہیں۔ نہیں یہاں صرف ایک چیز آزاد نظر آتی ہے اور وہ یہاں سے بھی دیکھ سکتا ہوں اور وہ جیلر کی کوٹھی ہے جو اینٹوں سے بنی ہوئی سرخ کوٹھی ہے۔ بلکہ گتھے کا رنگ ہے اس کا، جلے ہوئے خون کا رنگ، جی آسمان پر چاند کا دمکتا ہوا چہرہ ہے۔ نہ بھاری بھاری پپوٹوں کی خواب اور شراب، نہ دیوہیکل درختوں کی جنوں خیز سرگوشیاں ہیں۔ ساغر و مینا کی کھنک بھی نہیں، قہقہوں کا سونا بھی نہیں جس کی چھوٹ مری مصوری کی روح بن سکے۔ اب مجھے اس کا احساس ہو چلا ہے کہ میں نے اوپر جو کچھ لکھا ہے، بیکار لکھا ہے، نہ میں مصور ہوں، نہ افسانہ نویس۔ اور شاعری؟ تو سو پشتوں سے اس کا فاقہ ہے۔ لیکن ایک بات یہ بھی ہے کہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں، اس میں اپنا تذکرہ کرتے کرتے پرتھوی کا تذکرہ بھی کروں گا۔ کیونکہ میری گرفتاری میں اس کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اگر میں اس کا دوست نہ بنتا، اس کی بیوی اور ٹھٹھرتی ہوئی بچیوں کو پناہ نہ دیتا ——— ان سبھوں سے نفرت کرتا۔ ان پر تھوکتا۔ ان سے گھن کرتا ——— پرتھوی کو پولیس کے حوالے کر دیتا، تو یقیناً میں گرفتار ہو کر سوتنتر بھارت کے سوتنتر جیل میں نہ سڑتا ہوتا۔

ڈر نہ جائیے گا کہ میں کوئی بہت بڑا مجرم ہوں، نہ میں علی بابا ہوں، نہ بہرام ڈاکو۔ کم از کم مجھے اس کی خبر نہیں اور میرا قیاس ہے کہ حکومت کو بھی، اس کی خبر نہیں۔ اگر ہوتی تو ضرور بتاتی کہ میں کس گناہ کی پاداش میں نظر بند کیا گیا ہوں۔ دیکھئے نا، میں نے چوری نہیں کی، جیب نہیں اڑائی۔ رقیب کو زہر نہیں کھلایا۔ (کسی سے عشق ہی نہیں کیا، موقع ہی نہ ملا۔ یہاں تو بس پیٹ کمانے کی فکر کرو) کسی شریف آدمی کا گلا نہیں گھونٹا۔ کسی پیاری پیاری کومل کومل کم سن لڑکی کا اغوا نہیں کیا۔ نہیں بھائی یہ تاب، یہ مجال۔ یہ طاقت کہاں مجھے۔ پھر آپ کہیں گے۔ ہندو مسلم فساد میں سورما بننے کی کوشش کی ہوگی۔ یا شاید مہاتما کا ندھی کے خون میں ہاتھ رنگے ہوں گے۔ اگر یہ کیا ہوتا تو پھر آج یہ دن کیوں دیکھتا میرے دوست۔ دیکھتے نہیں وہ لوگ تو حکومت کا سہاگ بنتے چلے جا رہے ہیں۔

جو کچھ میں لکھ رہا ہوں، اگر آپ تک پہونچ گیا تو آپ کو ایک حسین دھوکا ہوگا۔ آپ فوراً کہیں گے آزاد دیش میں حلیہ ہی بدل گیا ہے۔ اندر ہوتے ہوئے تلخ نوائی کی اجازت ملی ہوئی ہے، تو عرض ہے بندہ پرور! کہ یہ خوش نصیبی میرے پتے نہیں پڑی۔ میں بہت کڑی نگرانی میں ہوں اور مجھ سے بھی کڑی نگرانی میں پرتھوی ہے۔ میں اور وہ دونوں ساتھ گرفتار ہوئے، خیر! یہ بھی بتاؤں گا تو مزا ہی کرکرا ہو جائیگا۔ مجھے بہت سی باتیں کہنا ہیں۔ ابھی صرف اتنا سن لیجئے کہ یہ سب کچھ لکھنے کا موقع مجھے کیسے ملا۔ سنیئے گا تو شاید آپ کا بھلا ہو اور ساتھ ہی ممکن ہے آپ کے ذریعہ دیش کا کلیان بھی ہو جائے۔

میں سات نمبر سیل میں بند ہوں - بالکل بند - سانس بھر ہوا آجاتی ہے - میں بھی حماقت کر گیا - اتنی سی بات لکھنے کی کیا ضرورت تھی - وہ تو آپ کی ذہانت سے امید تھی کہ خود بخود سمجھ جائیں گے - پرتھوی سیل نمبر سولہ میں ہے اور وہ اور میں دونوں بھوک ہڑتال پر ہیں - صرف وہ اور میں ہی نہیں، بلکہ بہت سے سیاسی قیدی بھوک ہڑتال پر ہیں - دیکھتا ہوں میں سلیقہ سے بیان نہیں کر رہا ہوں تو اس سلسلہ میں اپنی مجبوری اور حماقت کا اعتراف ہے - اس سے پہلے کبھی میں نے کہانی نہیں لکھی - بھلا بتائیے اچانک پریم چند کہاں سے بن جاؤں -

پہلے میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آخر کاغذ قلم کہاں سے فراہم ہوسکا - اگر صبر کے ساتھ اسے بھی جان لیں تو آپ کا تھوڑا اور بھی بھلا ہو جائیگا - آپ اپنی آزاد حکومت کی محبت، جمہوریت اور شرافت کا حال معلوم کر سکیں گے - دوسرے الفاظ میں آزاد حکومت کا بھی بھلا ہوگا - اس وقت رات کا وقت ہے - ایک لالٹین میرے آگے ہے - اس کی بتی جل کر بے ترتیب ہو گئی ہے - شیشے پر دھواں چھا گیا ہے اور روشنی میں صفائی باقی نہیں رہی - ایک معمولی قلم میرے ہاتھ میں ہے جو پتہ نہیں مہندر ناتھ نے کہاں سے حاصل کیا ہے اور میں سفید کاغذات پر کالے کالے واقعات لکھ رہا ہوں - اُف یہ نقوش کس قدر سیاہ ہیں بنگال کے کالے قانون کی طرح -

یہ سب لکھنا دراصل میری جدوجہد کا نتیجہ نہیں ہے - اس کا موقع تو مہندر ناتھ سپاہی کی مہربانی سے ملا ہے، وہی مہندر ناتھ جو آج پہرہ پر ہے - وہ ایک بوڑھا آدمی ہے - اس لئے غور سے سنئے ——— اس کی کھانسی میں ایک طرح کی کھرکھراہٹ اور تھکن ہے جوانی میں اس کا سینہ ابھار رہا ہوگا - اس کی آنکھیں رسیلی رہی ہونگی اور آواز کا وقار تو اب تک اس کی اپنی دولت ہے ——— اور وہ اس پر پوری طرح قابض ہے - اس نے اپنی زندگی کی لوٹ میں ایک چیز بچا رکھی ہے -

اصل بات تو پرتھوی اور اپنے بارے میں کہنا چاہتا ہوں، لیکن درمیان سے مہندر ناتھ ہی اس تذکرہ میں سمٹ کر چلا آرہا ہے - نہ جانے کیوں مجھے مہندر ناتھ اور پرتھوی کی آواز میں یگانگت معلوم ہوتی ہے اور جہاں تک مسکراہٹ کی بیساختگی کا تعلق ہے، دونوں کی مسکراہٹ ایک دوسرے کی رفیق ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی نقل معلوم ہوتی ہیں - میں تفصیل سے بچنا چاہتا ہوں اس لئے کہ ایک بار میرے ایک دوست نے کہا تھا، مختصر باتوں میں زیادہ اثر ہوتا ہے، لیکن مجھے اپنے دوست کی اس بات کا خیال نہیں - خیال اس کا ہے کہ کہیں مہندر ناتھ خفا نہ ہو جائے، وہ تقاضہ کر گیا ہے کہ جلد ہی سب کچھ لکھ لوں ورنہ اس کی شامت آجائیگی -

مہندر ناتھ نے ایک ربع بالٹی میں پانی رکھوایا - اور کہا " اس سے زیادہ پانی نہیں ملیگا - اتنی سی تو جان ہے اتنے ہی میں نہالو " اس نے اپنی انگلیوں کو بن کھلے کنول کے پھول کی طرح جوڑ کر میرے قد و قامت کا مذاق اُڑا دیا -

" ہوں - پانی پر بھی راشن ہے "

" تم بھوک ہڑتال سے قانون نہیں بدل سکتے - قانون بندوق سے بدلا جاتا ہے - قانون کے بدلنے سے پہلے تم خود ہی ختم ہو جاؤ گے "

" ہوں ——— " اور میں بھڑ بھڑ نہانے لگا -

" تمہارا جرم کیا ہے ——— " اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا -

" میں نہیں جانتا "

" تو تم بھی انقلاب کرتے ہوگے ——— "

میں حیران رہ گیا، یہ بیوقوفی تو میں نے کبھی نہیں کی - " میں نے کوئی انقلاب نہیں کیا، اسی لئے تو جیل میں ہوں "

" اچھا ——— " اس کا منہ اتر گیا " تم ڈرپوک ہو "

" میں ڈرپوک ہوں " میں بے بسی میں اس کا منہ تکنے لگا " میں تنہا رات کے وقت اس سیل میں رہتا ہوں اور

کہتے ہو میں ڈرپوک ہوں ——— میں ڈرپوک نہیں ہوں "

" ہاں ——— تم میرے بھائی کی طرح نہیں ہو ——— " اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اس کا سینہ سانس کے لمبے کش سے بھر گیا۔ اس کی مونچھوں میں جان پڑگئی۔ اس کے دبیز ہونٹ جن پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں ایک ذرا پھیلے۔ اس پھیلاؤ میں ایک چمکدار مسکراہٹ ناچنے لگی۔ جو اس میں اور پرتھوی میں مشترک تھی۔

" میرا بھائی دیویندر بھی انقلاب کرنے نکلا تھا، وہ بچپن ہی سے لڑاکا تھا گاؤں میں جب اس کی بھوری بھوری مسیں بھیگ رہی تھیں۔ ایک روز زمیندار کے لڑکے کی بندوق چھین کر پھینک دی۔ اس کی گالے سے زخمی ہوگیا تھا۔ جب وہ زخمی ہو کر گھر آیا تو ماں نے اسے بہت ڈانٹ پلائی۔ ماں نے وہ ساری ڈانٹ جو اسے زمیندار سے ملی تھی، اس پر انڈیل دی، وہ اسی وقت گاؤں چھوڑ کر یہاں چلا آیا میرے پاس۔ اس کی آنکھیں کتنی سرخ تھیں۔ اس کے ہونٹ ندامت سے سوکھ گئے تھے۔ لیکن چہرے کا غرور مجھے سب سے زیادہ پیارا لگتا تھا۔ کوشش کے بعد میں نے اسے بھی سپاہیوں میں بھرتی کروالیا "

وہ کھانسنے لگا " دیکھو! تم پانی بہت بہار رہے ہو " میں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ وہ مسکرایا " اس نے پولس ہڑتال میں اپنے ساتھیوں کا ساتھ دیا۔ میں نے اسے روکا۔ میں زندہ رہا اور وہ گورکھوں پر گولیاں برساتا رہا۔ جب اس کی کنپٹیوں کو چیرتی گولی پہاڑی کی طرف اڑ گئی تو وہ مرگیا۔ لیکن جو چیز کہاوت بن گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے بندوق کو مرنے کے بعد بھی نہیں چھوڑا۔ اس کی آنکھیں خون میں رنگ گئی تھیں۔ اس کے لبوں نے اپنا خون پی لیا تھا۔ اور یہ سب کانگرس راج میں ہوا تھا۔ اس کا غرور کتنا پیارا تھا۔ ایک وہ تھا ایک تم ہو، تم ڈر سے کہتے ہو انقلابی نہیں ہوں ——— " اس کے منہ سے تھوک نکل کر زمین پر پھیل گیا۔ اس نے بیڑی نکالی، ایک مجھے دی، ایک خود پھونکنے لگا۔ اور جب میری آنکھیں اس کی آنکھوں سے ملیں تو میں سمجھ گیا ——— کتنی حقارت، اور نفرت بھری ہوئی تھی اس کی آنکھوں میں۔

جب جیل میں سیاسی قیدیوں نے بھوک ہڑتال شروع کی تو اس نے کہا " تم لوگ سب مر جاؤ گے اور قانون نہیں بدلیگا جو قصہ تم نے مجھے سنایا ہے، لکھ کر مجھے دیدو میں اخبار میں چھپنے کے لئے بھیجدوں گا " اس پر اس نے اتنا زور دیا کہ آج میں اپنی کم علمی کے باوجود کسی نہ کسی طرح یہ کہانی آپ کو سنانے کو تیار ہوگیا۔

میں نے دیر کہا ہے کہ سیاسی قیدیوں کی بھوک ہڑتال میں میں بھی شریک ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کوئی سیاسی آدمی ہوں۔ خیر یہ تو آپ کو آگے چل کر معلوم ہی ہو جائیگا۔ میرا مکان، کرایہ کا مکان پیر ہوڑ میں ہے۔ میں جیل میں ہوں، لیکن میری ٹلنی اور سروپ وہیں ہیں۔ میرے مکان کے سامنے چھوٹے چھوٹے بہت سے جھونپڑے پھیلے ہوئے ہیں۔ میرا مکان جو دیکھنے میں پختہ معلوم ہوتا ہے اور جس میں غالباً کئی صدی سے پچاڑا نہیں پڑا، اس میں دو گھر ہیں۔ ایک میں میری بیوی ٹلنی اپنے بیٹے سروپ کے ساتھ سوتی تھی (اب کہاں رہتی ہے میں نہیں جانتا) میں بھی اسی کمرہ میں سوتا تھا، ایک اور کمرہ ہے جہاں کھانا پکتا تھا۔ (اب پکتا ہے کہ نہیں۔ میں نہیں جانتا)۔

اس کے سامنے ایک ٹیلے پر تالاب کے کنارے پرتھوی کا جھونپڑا تھا۔ اس کی بیوی اور تین کالی کالی بدصورت لڑکیاں وہیں رہتی تھیں۔ وہاں پر صرف مزدور لوگ رہتے ہیں۔ ذلیل اور کمینہ لوگ۔ ان میں صرف میں ہی کمینہ نہیں تھا، کہیں مکان ہی نہیں ملا، ورنہ میں کیوں اس آلائش میں رہتا۔ وہاں پر زیادہ تر کاٹن مل میں کام کرنے والے رہتے تھے۔ میں کاٹن مل میں کلرک تھا، شروع شروع میں پرتھوی بھی کاٹن مل میں " دیونگ " میں کام کرتا تھا۔ اس لئے وہاں ہڑتال کروائی۔ اس نے کہا مل مالک کا وعدہ جھوٹا ہے اس نے کہا ہندوستان میں آزادی نہیں آرہی ہے، یہ دھوکا ہے، اس نے منیجر کی ٹائی نوچ لی تھی ——— ایسے یہ بات سمجھ میں نہیں آئیگی، اس کا بھی ایک قصہ ہے۔

"منیجر نے اس سے کہا " اپنی پارٹی کا اخبار مل لیکر مت آیا کرو "

"اس میں تمہارا کیا بگڑتا ہے ــــــ "

"یہاں تم کپڑا بننے آتے ہو یا اخبار بیچنے ــــــ "

"میں اخبار لاؤں گا ــــــــ " پرتھوی اور تن گیا۔

"اخبار لاؤ گے ــــــ ؟ "

"ہاں لاؤں گا ــــــ "

"لاؤ گے ــــــ "

"ہاں ــــــ "

منیجر کی عینک چمکنے لگی ۔ اس کے منہ میں تھوک بھر گیا اور وہ آستین کے بٹن کھولنے اور بند کرنے لگا ۔ اس کے منہ سے کچھ گالی نکل گئی ۔ ہونٹ کے دونوں کناروں پر تھوک کا بلبلا چھوٹنے لگا ۔ پرتھوی نے اچک کر اس کی گردن پکڑ لی ۔ مل میں شور مچ گیا ۔ موٹے موٹے پلے ہوئے دربان دوڑ پڑے نیپالی دوڑ پڑے ۔ مزدور دوڑ پڑے اور معاملہ ختم ہو گیا، لیکن معاملہ اس طرح ختم نہیں ہوتا دوسرے دن پرتھوی کو کام نہیں دیا گیا ۔ اس کی مشین منہ لٹکائے خاموش رہی ۔ اور گیارہ بجے اور دوسرے مزدوروں نے بھی ہڑتال کر دی اور ساری مشینیں خاموش ہو گئیں ؛ ہکا بکا، مبہوت ۔ کپڑے کے تھان تھک کر رہ گئے ۔ دو گھنٹہ کے بعد ہڑتال ختم ہو گئی اور جب دوبارہ مشینیں گرجنے لگیں تو معلوم ہوا کہ ہزاروں گاڑیاں ایک ہی بار، ایک ہی پلیٹ فارم پر رُک گئی ہیں ۔ اور زور سے سانسیں لے رہی ہیں ۔ اس وقت دوسری مشینوں کے ساتھ پرتھوی کی مشین بھی سانس لے رہی تھی، دمہ کے مریض کی طرح ۔ اور وہ مسکرا رہا تھا ۔ اور اس کی مشین بھی قہقہہ زن تھی ۔

وہ مسکراہٹ جس میں کشش ہے، پارہ ہے، تابانی ہے، اور جو ناقابل شکست ہے، جو دائم ہے، رواں دواں خنجر بکف ۔ ندی کی موجوں کی طرح جو ایک تسلسل میں بندھی ہے، جو اسے ماضی سے ملی ہے، شائد تاج محل کے معماروں سے، شائد اجنتا کے فنکاروں سے لیکن یہ مسکراہٹ جگنو کی طرح جل کر تاریکی میں ڈوب جانے والی مسکراہٹ نہیں ہے ۔ وہ مسکراہٹ ایک زمانہ ہے، جو چل رہا ہے اور جو چلتا جائیگا ــــــ کم از کم مجھے تو پرتھوی کی مسکراہٹ مفید نہیں معلوم ہوتی ۔ یہ مسکراہٹ زندہ رہیگی، پرتھوی مرجائے گا ۔ بھوک ہڑتال سے وہ مر جائیگا ۔ لیکن کون ہے جو اس للکارتی ہوئی مسکراہٹ کا گلا گھونٹ سکے ۔ سنا ہے کہ ایسی مسکراہٹیں ہٹلر کی اذیت گاہوں سے بھی زندہ نکل بھاگی تھیں ۔ ممکن ہے آپ کہیں، بک رہا ہے جنوں میں کیا کیا کچھ، ۔ ممکن ہے میں کوئی افسانہ نگار ہوتا ۔ کرشن چندر ہوتا ۔ گورکی ہوتا تو اس کی سچی تصویر کھینچ سکتا، تو اس حیثیت سے بھی قابل معافی ہوں، بندہ پرور ! ۔

بات کچھ بن نہیں رہی ہے، واقعی جو لوگ افسانہ لکھتے ہیں جوئے شیر لاتے ہیں ۔ مجھے تو سردی میں پسینہ آگیا ۔

تو پرتھوی، اسی جھونپڑی میں رہتا تھا ۔ پہلے وہ وہاں پر نہیں رہتا تھا ۔ کہاں رہتا تھا، میں نہیں جانتا ۔ البتہ میں اسے اس وقت سے خوب جاننے لگا تھا ۔ جب مل میں ہڑتال ہوئی تھی اور وہ گرفتار ہو کر جیل چلا گیا تھا ۔ اور جب چھوٹ کر واپس آیا تھا تو اسے کام نہیں دیا گیا ۔ اور وہ اس کے بعد اسی جھونپڑے میں چلا آیا ۔

ایک صبح نیم کے داتون سے منہ صاف کرتے ہوئے میرے پاس آیا ۔ آفتاب پہاڑی کے سر پر چمک رہا تھا ۔ تالاب کی کیچڑ میں مرغیاں بطخیں اور سور دوڑ رہے تھے ۔ کچھ عورتیں برتن مانجھ رہی تھیں اور میں گندگی کی عزت افزائی دیکھ کر کڑھ رہا تھا ۔

"کہئے اب مل کا کیا حال ہے ــــــ ؟ "

"وہیں چکال ہے ــــــ تم تو اچھے ہو پرتھوی "

"سب ٹھیک ہے ——" اور اپنی مسکراہٹ کے ساتھ نیم کے درخت سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اور زور زور سے منہ صاف کرنے لگا۔ وہ ایک موٹر کے کارخانہ میں کام کرنے لگا تھا۔ صبح کا گیا شام کے بعد ہی لوٹتا۔ موبل اور پیٹرول کی خوشبو بکھیرتا ہوا آتا۔ اس کے کپڑے بالکل سیاہ رہتے۔ ایک گچھا اس کے کاندھے پر پڑا رہتا۔

میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے دیکھتا۔ اس کی بیوی جو جوان ہوتے ہوئے جوان معلوم نہ ہوتی اور میں نے تو کبھی اتفاقاً مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ممکن ہے وہ کمرے میں بند ہو کر مسکراتی ہو اور یوں مسکرانا بیجائی خیال کرتی ہو۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک روز جب پرتھوی میرے قریب آیا تھا بہت درد انگیز آواز میں کہنے لگا:

"کرانی بابو —— آپ نہیں جانتے میں کتنے دکھ میں ہوں۔ میری بیوی کو زنانہ بیماری ہے، جب وہ بیاہ کر آئی تھی بہت اچھی تھی۔ میرا مطلب ہے مجھے پیاری لگتی تھی" اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ انگارے کی طرح لپک آئی، پھر فوراً اس کی مسکراہٹ ایک تلخ آواز میں غرق ہو گئی "کمائی کچھ نہیں، مل میں جو کچھ کماتا، کھانے پینے پر ہی پورا نہ ہوتا تھا۔ دوا کہاں سے لاتا۔ ابیں۔ موٹر کے کارخانہ میں تو اور بھی حکومت چلتی ہے سالوں کی۔ پیسہ کچھ نہیں دیں گے اور جب کچھ کہو کشمیر اور حیدرآباد کی دہائی دینے لگیں گے۔ جیسے ہم ہی لوگوں نے کہا ہو بھیا کشمیر اور حیدرآباد کی گدی ہمیں سونپ دو۔ ہم راج کریں گے۔ ہوں"

وہ اپنے بچوں کو بہت مانتا تھا۔ اس کی بیوی تقریباً روز ہی میرے یہاں آ کر میری بیوی سے بات چیت کیا کرتی تھی۔ وہ اپنا دکھڑا روتی رہتی۔ بچوں کی بیماری کا دکھڑا، غلہ کی گرانی کا دکھڑا اور کبھی کبھی منہ بسور کر کہتی "اس کے بابو جی بھی اچھے نہیں رہتے ہمیشہ تو کھانستے رہتے ہیں ——"

اور جب پرتھوی واپس آ کر ان لوگوں کو اپنے گھر میں نہیں دیکھتا تو اپنے بچوں کو وہیں سے پکارتا اور اس کے تینوں بچے دوڑ پڑتے، نیچے اوپر اور اس کی بیوی بھی گھونگھٹ نکال کر چلی جاتی جھٹ پٹ!۔ اسی طرح زندگی کے دن موج در موج بہتے گئے۔

اب میں رات کو بیٹھ کر پرتھوی سے بحث کیا کرتا تھا۔ میں حکومت کی طرفداری کرتا اور جلی کٹی سناتا۔ وہ کشمیر کی لڑائی کو اپنی بحث میں لانے نہیں دیتا۔

"میں سیدھا سادھا مزدور ہوں، آپ لوگ اونچے لوگ ہیں۔ کرانی لوگ ہیں۔ لیکن ہم لوگوں کی بھوک کا علاج آپ کی بحث سے نہیں ہوگا۔ نہ کشمیر سے ہوگا۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ جو روپیہ وہاں خرچ ہو رہا ہے بیکار ہو رہا ہے، وہ جنتا کے کام آ سکتا تھا" میں اس پر بگڑ جاتا۔

وہ مسکرانے لگتا، وہ اس کا آخری ہتھیار ہوتا۔ پھر آہستہ آہستہ کہتا "آپ لوگ جلی ہوئی رسی کی طرح ہیں کرانی بابو —— کیا مطلب —— کیا کہا" میں پوچھتا چلا جاتا۔ وہ مسکراتا ہوا اٹھتا اور چلا جاتا۔ پھر اس نے مجھے ایک اخبار لا کر دینا شروع کیا۔ اس کے پیسے بھی وصول کر لیتا۔ شروع میں تو گراں گزرا۔ لیکن جب دیکھا کہ اس اخبار میں بات اپنے دکھ درد کی ہے میں جی لگا کر اسے پڑھنے لگا۔ ایک بات سے البتہ میں بدکتا تھا۔ اس میں حکومت کے خلاف بہت سی باتیں ہوتی تھیں۔ یوں ظلم ہو رہا ہے۔ یوں کسان پر لاٹھیاں برسیں۔ یوں مزدور کچلے جا رہے ہیں۔ لیکن میرا ایمان بہت مضبوط تھا۔ میں ان پروپگنڈوں کا شکار نہیں ہوا۔ میں اپنی حکومت کو معصوم سمجھتا تھا۔ بالکل گائے۔ پتہ نہیں۔ یہ تشبیہ کہاں تک ٹھیک ہو۔ ویسے میں بیچو دھوبی کے گدھے کو ہندوستان کی معصوم ترین ہستی سمجھتا ہوں۔

ہم لوگوں کا ماحول بہت ہی گھٹا ہوا اور گندہ تھا۔ ہر وقت سڑی ہوئی بو ادھر ادھر سے آتی رہتی تھی۔ بچے گلی ڈنڈا کھیلتے رہتے۔ چھوٹے چھوٹے ننگے بچے ماؤں کے تھنوں کو چوس کر تھک جاتے تو رونے لگتے اور روتے روتے تھک جاتے تو تھنوں میں لٹک جاتے۔ یہی منظر تقریباً ہر جھونپڑے کے باہر نظر آتا۔

جیسے جیسے آزادی پرانی ہوتی گئی، کسانوں اور مزدوروں پر مظالم کی کہانی زیادہ آنے لگی - پھر کلرکوں کی ہڑتالوں کی کہانی بھی ادھر اُدھر سے سنائی دی - میں اور بھی چکرایا - یہ کلرکوں کو کیا سوجھی تھی - دیش کمزور تھا - حیدرآباد پر حملہ کی تیاری تھی، پاکستان فوج بنا رہا تھا، ہندوستان فوج بنا رہا تھا - لڑائی کی تیاری تھی اور مزدوروں کے ساتھ کلرکوں نے بھی حماقت شروع کر دی - ذرا صبر نہیں - میں اسی طرح سوچا کرتا اور پرتھوی مجھ پر پھبتی کستا اور میں چراغ پا ہوتا - میرے تلوے کی آگ سر پر پہونچ جاتی اور وہ اپنی مسکراہٹ کے بھنور میں مجھے لے ڈوبتا - اور میں کاغذ کی ناؤ کی طرح چکرا کر ڈوبنے سے پہلے ایک لمبی سانس لیتا -

لیکن یہ سب تو آپ کو فضول باتیں معلوم ہو رہی ہونگی - اس لئے کہ آپ کو ابھی تک کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوئی - لیکن میں آپ کو نئی بات بتاؤں گا اور وہ نئی بات یہ ہے کہ میں تو حکومت کی معصومیت کے گن گاتا رہا اور ادھر یہاں جیل میں آپڑا - یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ میں اسے پروپگنڈہ کہہ کر ٹال نہیں سکتا -

ایک روز میں ایس - ڈی - او کے یہاں مل کے کام سے گیا تھا - وہاں پولیس والے جمع تھے اور کسی کی گرفتاری کی باتیں ہو رہی تھیں، مجھ پر کوئی خاص اثر نہ ہوا - لیکن جب میں واپسی پر موٹر کے کارخانے کی طرف گذرا تو ایک ذرا پرتھوی کے پاس رک گیا - پرتھوی ایک حسین سی فاختئی کار کو صاف کر رہا تھا - کار دو پٹریوں پر فضا میں بلند تھی - اور پرتھوی ایک میلی اور چکنی سی پچکاری سے اسے صاف کر رہا تھا - اس کے کپڑے صافی ہو گئے تھے - اس کی پیشانی پر انگلیوں کے سیاہ نشان ثبت تھے - جیسے ابھی کسی نے کیچڑ میں اٹے ہوئے ہاتھ سے اس کے ماتھے پر ہتھیلی رکھ کر بخار کا اندازہ کرنے کی کوشش کی ہو -

وہ مجھے دیکھتے ہی مسکرایا - اور اس کی چھوٹی سی مونچھ کی لکیر بھی ساتھ ہی مسکرا پڑی - اس کے ہونٹ کھلے ہوئے تھے - اس کے سفید دانت چرمی منی بیگ سے نکلے ہوئے روپے کی طرح جھلک پڑے -

میں اسے کنارے لے گیا -

" کہئے کدھر چلے آئے آپ ---- ؟ " وہ مخصوص انداز میں گردن کو جھٹکتے ہوئے بولا

" بس یونہی ---- "

" چلئے پان کھا لیجئے ---- " میں کترانا چاہتا تھا - اس نے اپنا ہاتھ میرے بازو پہ رکھ دیا - لیکن دوسرے ہی لمحہ میں اس کا ہاتھ واپس لوٹ گیا - میری سفید قمیص پر نشان نمایاں تھا، وہ کھسیانا ہو کر دیکھنے لگا - میں جبراً مسکرا پڑا - اس کے دانت پھر نکل پڑے - اس کی جوان مسکراہٹ کا خلوص نئی شاعری کی طرح صاف اور شدید تھا، شاداں و رقصاں، جھلمل جھلمل سا اور مجھے محسوس ہوا کہ اس نے کھوٹے سکوں کے عوض جیب میں چاندی کی ڈلی ڈال دی تھی -

" آج پولیس تمھاری پارٹی پر حملہ کرنے والی ہے ---- "

" ہیں ---- " وہ بالکل سنجیدہ ہو گیا - اس نے جلدی جلدی پان کے پیسے دیئے اور مجھ سے اجازت لیکر کارخانے میں چلا گیا - میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا - میری نظر میں وہ ایک حد تک اشتراکی بھی تھا -

جب میں شام کے وقت گھر پہونچا تو معلوم ہوا کہ پولیس والوں نے پرتھوی کے گھر کی تلاشی لی، اس کی بیٹی کو جو چیخ رہی تھی ایک طمانچہ رسید کیا - اور اس کی بیوی کو بہت سی دھمکیاں دیں، وہ کارخانے سے غائب تھا - اس کی تلاشی ضروری تھی - میں نے سمجھا شاید کشمیر فتح ہو گیا ہو - اور پرتھوی کی حکومت دشمنی کا حال اس پر کھل گیا ہو - میں رات گئے تک اس کے بارے میں سوچتا رہا - اس کی مسکراہٹ افق سے برستی ہوئی روشنی کی نرم پھواروں کی طرح میری بند آنکھوں میں گدگدی کرتی رہی - میری سانسیں تھم جاتیں، کبھی تیز ہو جاتیں - پتہ نہیں وہ کیوں نہیں لوٹا -

دوسرے دن معلوم ہوا کہ پرتھوی کی پارٹی کا ایک آدمی بھی گرفتار نہ ہو سکا اور مجھے محسوس ہوا کہ پرتھوی کی مسکراہٹ کی آگ

میرے ہونٹوں میں بھی رینگ رہی ہے۔ اور میں قبل ہی کہہ چکا ہوں اس کی مسکراہٹ صرف اس کی ملکیت نہیں ہے۔ اس روز وہ ملکیت میری بھی تھی۔

اس کی بیوی بہت پریشان رہنے لگی۔ بار بار پولیس آکر اسے تنگ کرتی تھی۔ ایک تو گھر میں پیسے نہیں تھے اس کا بار۔ اس پر یہ ظلم دوہری مصیبت تھی! میرے یہاں آکر روتی رہتی۔ اس کے بچے روتے رہتے۔ پھر وہ سلائی اور برتن مانجھنے کا کام کرنے لگی۔ ایک روز پولس والوں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کے جھونپڑے سے برتن نکال کر باہر پھینک دیئے۔ اس روز مجھے بہت غصّہ آگیا۔ مجھے ۱۹۴۲ء کے ظالم یاد آ گئے۔

پھر وہ رات کو اپنی لڑکیوں کے ساتھ میرے مکان میں سونے لگی۔ میری بیوی اسے دلاسے دیا کرتی۔ پرتھوی کی بیوی بچوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں سوگئی تھی۔ اور میری بیوی بیمار تھی۔ میں بار بار اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف سنّاٹا تھا ریل گاڑی کی چیخ سنائی دے رہی تھی۔ اور کھڑکی سے سگنل کی سرخ آنکھیں گھورتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ میں بہت پریشان تھا۔ تنخواہ بالکل ناکافی تھی۔ ستّر اسّی روپیہ میں کیا ہوتا تھا۔ کھاؤ تو کپڑے نہیں۔ کپڑے بنواؤ تو ہونٹ سلوا لو۔ ایک مصیبت۔ جو روز بروز زیادہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ میری آنکھیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ پھر تھوی کی بیوی کا خرّاٹا ہلکا ہوتا جا رہا تھا کہ دستک ہوئی ــــ

دھب دھب ــــ کھٹ کھٹ!

میں چپکے سے نیچے اتر گیا۔ دروازہ کھولا۔ لالٹین کی روشنی میں ایک سادھو نما انسان کھڑا تھا۔ وہ مجھے لئے ہوئے سیڑھی پر آگیا۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ میں خوف زدہ تھا۔ میرے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میں صرف اسے گھور رہا۔ اس کے خشک ہونٹوں پر ایک کرن ابھری جو اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ اور اس کی سیاہ داڑھی بھی اس مسکراہٹ کی عظمت کو نہ چھپا سکی۔ میں اس سے لپٹ گیا۔ اس سے پہلے کبھی بھی پرتھوی سے لپٹا نہیں تھا۔ پتہ نہیں کیوں میں جذبات سے بھر گیا۔ میری آنکھیں نم سی ہوگئیں۔ میں اسے لیکر اوپر چلا آیا۔

وہ میری بیوی کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سروپ کو دیکھا۔ کھڑکی سے جھانک کر اس نے گلی کی طرف دیکھا۔ ایک دم سنّاٹا تھا۔ کتّے بھونکنے کی آواز دور سے آرہی تھی۔ جیسے پتھریلی زمین میں کوئی کھیتی چلا رہا ہو۔ سگنل کی سُرخ آنکھوں کو اس نے دیکھا۔ پھر وہ میرے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر اس نے کچھ تلاش کرنا شروع کیا۔

"تمہاری بیوی اور بچے دوسرے کمرے میں ہیں ــــ"

"ٹھیک ہے ــــ"

اس نے پورا قصّہ سنا۔ پھر کہنے لگا میں سب جانتا تھا۔ مجھے ہر چیز کی خبر تھی۔ "جب میری بیوی اور لڑکیاں تمہارے یہاں چلی آئیں تو مجھے اطمینان ہوگیا۔ میں اپنے کام میں مگن تھا۔ میں چار مہینے تک بیمار رہا۔ اب طاقت آئی ہے۔ آج مجھ سے برداشت نہ ہوسکا۔ چلا ہی آیا۔" اس کے لہجے میں کتنا عزم تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ایک مسرت انگیز لمبی سانس جو چیخ سے ملتی جلتی تھی صاف سُنائی دی۔

میں نے بیوی کی نبض کو دیکھا۔ ویسی ہی پھڑک رہی تھی۔ پھر مجھے نیند آگئی۔ جب پرتھوی نے جگایا تو میں اُٹھ بیٹھا رات باقی تھی۔ وہ گلی میں اتر کر۔ ریلوے لائن کی طرف چلا گیا۔ کاٹن مل کا سائرن کتّے کی طرح رونے لگا۔ پھر صبح ہوگئی لیکن میں سو نہ سکا۔ میرا دل بہت دھڑک رہا تھا۔ دوسرے دن میرے ذہن میں پرتھوی چھایا رہا، اس کے الجھے ہوئے بال، اس کی داڑھی، اور اس کی مسکراہٹ۔ رات کے وقت میں دیر سے گھر پہنچا۔ دوا لانے کے لئے چلا جانا پڑا جب گھر پہنچا تو

پرتھوی پہلے سے موجود تھا۔ اس کی بیوی نلنی کے تلوے رگڑ رہی تھی۔ اور سروپ سو گیا تھا۔ پرتھوی کی لڑکیاں بھی وہیں پڑی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد جب سرکہ کی پٹیاں دیر تک نلنی کے ماتھے پر رکھی جاتی رہیں تو اُس کا بخار کچھ دھیما پڑا۔ میں پہلے والی رات کو بہت بے چین رہا تھا اس لئے نیند آ رہی تھی۔ پھر بھی پرتھوی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ اخبار پڑھنے میں لگا ہوا تھا۔ ہندی کا اخبار تھا اور میں ہندی نہیں جانتا تھا۔ میں نے یوں ہی بات چھیڑنے کو کہا "کیا خبریں ہیں، ذرا سناؤ تو"

"خبر بہت شاندار ہے۔ ہاں — آپ کے نہرو جی لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ آرام اور تفریح کے لئے اُن کے خاندانی مکان گئے ہیں"

"کوئی خاص بات نہیں — یہ تو روز ہی سنتے ہیں — تم بتاؤ کہاں کہاں رہے۔ اور تم تو بڑے خطرناک نکلے۔ میں تو سمجھتا تھا۔ تم لیڈر ویڈر نہیں ہو —"

"تو کیا اب میں لیڈر ہو گیا۔ ہمارے یہاں کا ہر آدمی اس وقت خطرے میں ہے خواہ کوئی بھی ہو۔ میں تمہارے یہاں آیا ہوں۔ اس وقت تم بھی خطرے میں ہو —" اس سے پہلے وہ کبھی بھی مجھے تم نہیں کہتا تھا۔

وہ سیاسی باتیں کرتا رہا۔ جب سے وہ گیا تھا میں نے اس کا اخبار نہیں پڑھا تھا اس نے بہت سی نئی نئی باتیں بتائیں۔ پہلی مرتبہ میں نے خود کو خطرے میں واقعی محسوس کیا۔ لیکن میں خوش تھا کہ میں کوئی برا کام نہیں کر رہا تھا۔

وہ اپنی بیوی سے بات چیت کرنے لگا۔ میں سو گیا۔ جب پرتھوی نے جگایا تو صبح ہو رہی تھی۔ وہ بہت پریشان تھا۔ اس نے کہا میں چپ رہوں۔ میں اور بھی بوکھلا گیا۔ میری بیوی سوئی ہوئی تھی، سروپ کا ایک ننھا سا ہاتھ اس کی گردن پر تھا۔ اور وہ بھی سویا ہوا تھا۔

"تمہارا مکان گھرا ہوا ہے۔ پولیس ہے۔ دیکھو دور سڑک پر پولیس وان ہے — بتاؤ کوئی بھاگنے کا راستہ ہے کہ نہیں"
پولس وان دھندلکے میں ایک سیاہ ہاتھی کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی گھبراہٹ دور ہو گئی اور وہ دوسری طرف چھت کے نیچے سے ہو کر دوسرے نزدیک کے مکان کی اوٹ پر چلا گیا۔ اور وہاں سے لوہے کی پائپ کے سہارے ریلوے لائن کی طرف اتر گیا۔

سیڑھی پر زنجیر بجنے لگی۔ میں مطمئن تھا۔ کوئی کیا بگاڑ لیگا۔ لیکن جب دروازہ کھولنے گیا تو پھر واپس نہیں لوٹا۔ اس روز نہرو جی ماؤنٹ بیٹن کے خاندانی مکان پر تفریح اور آرام کے لئے گئے تھے اور میں شاہی مہمان خانے میں تفریح کرنے پر مجبور کیا گیا تھا

دوسرے ہی دن مجھے معلوم ہو گیا کہ پرتھوی بھی گرفتار کر کے سولہ نمبر سل میں رکھا گیا تھا۔ اس دن سے آج تک ہم یہاں ہیں۔ گرفتاری کے دن نہرو جی نے ماؤنٹ بیٹن کے دولت کدہ کو زینت بخشی تھی۔ آج دیوالی کی رات ہے۔ اور میں نے سنا ہے کہ پنڈت جی پیرس میں ایک شاندار ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ وہ پنڈت جی ہیں جن کے لئے میں پرتھوی سے لڑ جاتا تھا۔ اس سے منہ پھلا لیتا۔ لیکن وہ اٹیلی اور ماؤنٹ بیٹن کی دعوتوں میں کھو گئے ہیں۔ انھیں ہز مجسٹی کنگ کی مسکراہٹوں کا عرفان ہے سنا ہے پانی ڈھلان کی طرف دوڑتا ہے۔ اس لئے میں پرتھوی کے ساتھ ہوں۔ اپنی اپنی منزل ہے۔ کوئی کیا کرے۔ لیکن میں خوش ہوں کہ مجھے ایک ناقابل شکست سچائی کی رفاقت حاصل ہے۔

یہاں ہمیں ہر طرح کا آرام ہے۔ ویسے ہمیں سل میں رکھا گیا ہے۔ ہمیں ذلیل ترین قوموں کی طرح رکھا جاتا ہے۔ کھانے میں کنکر اور بالو ملا رہتا ہے۔ اور جب ہم دانت چلاتے ہیں تو اچانک دانت چلنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ کمبخت میں ہی مریے قسم کے دانت بالو اور کنکر ہیں تو کیا ہوا، پس جائیں گے، کوئی دیس بھگت پیارے پیارے رہنما تو نہیں۔ لیکن پھر بھی یہ دانت نہیں چلتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ

یہ کھانا پیرس کی نمائش گاہ میں رکھ دیا جائے۔ سنا ہے پیرس خود ایک نمائش گاہ ہے۔ جب ہمارے ہر دلعزیز رہنما وہاں ہیں تو میرا جی چاہتا ہے، یہ کھانا بھی وہاں ضرور جائے۔ ہو سکتا ہے یہ بھی احمقانہ خواہش ہو۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے تو میں آپ کے ساتھ ہوں ساتھ ہی آپ کے حال پر ترس آتا ہے۔

جس حکومت کا میں وفادار ہوں، اس سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ میں تو تمہارے شاہی مہمان خانہ میں ہنسی خوشی دن گزار رہا ہوں، بھوک ہڑتال میں بھی کیا کم ہنسی خوشی ہے۔ لیکن یہ پوچھنا تو جائز ہے کہ آخر کس قصور پر گرفتار ہوا ہوں۔ جان کی امان پاؤں تو ایک بات پوچھوں۔ کیا ہمارا قصور کوئی کوہ نور ہیرا ہے جو خزانے میں بند کر دیا ہے سرکار نے؟ اور تاب گفتگو لا سکوں تو عرض کروں، — میری نلنی اور سروپ کا کیا ہوا!؟ کیا نلنی بیمار ہے؟۔ کون دوا لاتا ہے؟۔ کون غلے لاتا ہے؟۔ پرتھوی کی بیوی اور بچیاں ہیں؟۔ کیا وہ بھوکی زندہ رہ سکتی ہیں؟۔ اگر ایسا ہے تو پھر تمہاری دین ہے۔ تمہارا احسان ہے۔

میں اور کچھ پوچھنا نہیں چاہتا۔ میں سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں لئے نہیں پھرتا۔ جیسے وطن کے رہنماؤں کو ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں صرف اپنا مسئلہ سامنے رکھتا ہوں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس طرح کے سوالات ہزاروں دلوں میں پیچ و تاب کھا رہے ہیں، اور ہر جگہ ہمندر ناتھ سپاہی نہیں ہے جو ان سوالوں کو ہزاروں کے سینوں سے چھین کر حکومت کے چہرے پر دے مارے۔

شاید آپ کو میری باتیں پسند نہ آئیں۔ ممکن ہے آپ ابھی تک اس خوش فہمی کا شکار ہوں جس کا کچھ پہلے تک میں شکار تھا، آنکھوں کی پٹی تو جیل آکر کھلی ہے۔ شاید آپ کو سوچ ہے کھا کر حج کرنے والی بلی کی پارسائی پر یقین ہو۔ لیکن مجھے اسی چیز نے اس مہمانخانہ میں پہونچایا ہے۔ اسی چیز نے کسی کو پیرس پہونچا دیا ہے اور کسی کو سات نمبر سیل میں۔ اب یہ نہیں ہوگا۔ پرتھوی ٹھیک راستے پر تھا۔ وہ ٹھیک راستہ پر ہے۔ سیدھی بات ہے۔ جو لوگ میری باتوں کو پسند نہیں کرتے وہ میرے دوست نہیں ہیں، وہ ماؤنٹ بیٹن کے دوست ہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں۔ وہ ان ہزاروں انسانوں کے دوست نہیں ہیں جن کی ملاقات ابھی ہمندر ناتھ سے نہیں ہوئی ہے۔ میں جانتا ہوں ہمندر ناتھ ایک طوفان ہے۔ ایک سمندر ہے اور وہ پھیل رہا ہے، بپھر رہا ہے، امڈ رہا ہے۔ اور جب یہ سمندر پوری دھرتی کو اپنی گود میں لے لیگا، اس وقت ان ہزاروں انسانوں کی گھٹی ہوئی آواز دھماکے کے ساتھ فضا میں پھیل جائیگی۔ پھر یہ آواز کھیتوں میں اُگیگی۔ اور فیکٹریوں میں ڈھلیگی۔ اور سب شانت ہو جائیگا۔

پھر میں پیرس جاؤں گا۔ پرتھوی پیرس جائیگا۔ نلنی پیرس جائیگی۔ سروپ پیرس جائیگا۔ پرتھوی کی بیوی اور بچیاں پیرس جائیں گی۔ اور پھر کوئی ہمیں دیکھ کر رومال میں منھ چھپا کر ہنسیگا نہیں۔ پھر میں وہاں ہوٹل میں بند نہیں رہوں گا۔ لوگوں کی نمائشی دعوتیں نہیں کھاؤں گا۔ اور پھر میں ان مزدوروں سے ملوں گا جنھوں نے پیرس کو حسن دیا ہے۔ ویسے ہی لوگ جنھوں نے اجنتا اور تاج محل کی تخلیق کی ہے۔ جو لوگ ایسی تخلیق کی طاقت رکھتے ہیں نہ جانے وہ خود کتنے حسین ہوں گے! — اور میں مسکراؤں گا۔ اسی طرح جیسے پرتھوی مسکراتا ہے۔ اور تب ہمارے قدموں سے سڑکیں میلی نہ ہوں گی۔ اور تب میں پیرس کے ہوٹلوں میں کتوں کی طرح نہیں رہوں گا۔ اور جب میں یہاں رہوں گا، اپنے وطن میں۔ تو نہ یہ تالاب رہیگا جس میں سور، بطخیں اور کالی کالی عورتیں ایک ساتھ نہاتی ہیں — وہاں ایک حسین پارک ہوگا۔ اس میں ہنسوں کی طرح کپڑے پہنے سروپ کے ساتھ پرتھوی کی بچیاں کھیلتی ہونگی — ہمندر ناتھ کی کھانسی قریب آرہی ہے، اس لئے ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ ویسے کمزوری بھی معلوم ہو رہی ہے۔ آج صبح سے بھوک ہڑتال کا چوتھا دن شروع ہوتا ہے۔

ہاں تو وہ ایک بات یہ ہے کہ جب یہ بیان چھپ جائیگا تو میں سمجھوں گا کہ میں نے ایک درندے کے چہرے سے آدمی کی نقلی کھال اُدھیڑ ڈالی ہے — میں نے اس کے چہرے سے انسانیت، جمہوریت اور آزادی کا ملمع دھو ڈالا ہے — اور پھر اس چہرہ پر ہمارے ناخنوں کے ہزاروں زخم اُبھر آئیں گے — دیوالی کے دیوں کی طرح جو جیبار کی کوٹھی کو

جگمگا رہے ہیں ——— لیکن جن کی جگمگاہٹ ———

یہ مہندر ناتھ سامنے آگیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک ہے۔ اس کی کھانسی رُک گئی ہے۔ اور وہ جیلر کی کوٹھی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جہاں سرِ شام جلنے والے بہت سے چراغوں میں سے کچھ دم توڑ چکے ہیں اور باقی ہچکیاں لے رہے ہیں —— !

—— (انجمن ترقی پسند مصنفین گیا میں پڑھا گیا) ——

(بقیہ "زندگی یوں بھی")

کمزور پاؤں کے نیچے کی سیڑھی کھسک گئی اور وہ گر گیا۔ میں نے لپک کر اُسے سنبھالا۔ اس کے چہرے کی گھٹلی زرد پڑ گئی تھی میں بوڑھے کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر بوڑھا مر گیا تو گلی کا چراغ کون جلائیگا۔ بوڑھا فضل دین اپنی پگڑی سے آنکھوں کا میلا پانی پونچھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"شریف آدمیوں کی بستی میں ہم جیسے بدمعاشوں کا گذر نہیں ہونا چاہیئے"۔ بوڑھے کے منہ سے "ہم جیسے بدمعاش" کا ذکر سُن کر دل یکبارگی بھر آیا۔ اس گلی میں ایک شخص ایسا تھا جس سے میں ہمیشہ نفرت کرتا رہا جسکی موت کے لیئے دعائیں مانگتا رہا۔ جس کے دعا سلام کا میں نے کبھی جواب نہیں دیا۔ وہ میرا غمخوار ہے شریک ہے۔ رفیق ہے۔ جی چاہتا تھا کہ بوڑھے کے گلے لپٹ کر زور زور سے روؤں۔ اس کی سفید ڈاڑھی کو اپنے آنسوؤں سے بھگو دوں اور اُس پر میلے پانی کے داغوں کو مٹا دوں۔ اور کہوں بابا میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا۔ لیکن فضل دین محلہ والوں کو ماں بہن کی فحش گالیاں دیتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اور میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ میرے ہاتھ بھی ہوا میں لٹکے رہے۔ میری نگاہوں میں سارہ کی ایک لڑکی گھوم گئی۔ اِتنے میں وہ سانولی لڑکی گذری۔ اُسکے چہرہ پر وہی کرب آمیز مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"آپ بھی جا رہے ہیں" اس کے بعد وہ ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر یکایک چُپ ہو گئی...... جیسے اس کا دل درد جاگ اُٹھا ہو۔ میں خاموشی سے چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی لو کو دیکھ رہا تھا۔ اگر یہ چراغ بھی بجھ گیا تو مکمل تاریکی چھا جائے گی لڑکی نے میری ذہنی الجھن کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"جب تک دھرتی اناج اگاتی رہے گی اور اس کی چھاتی پر گیہوں سنہری خوشے سورج کی روپہلی کرنوں میں چمکتے رہیں گے اور جب تک اِنسان کے دل میں خودی کی ننھی سی کرن بھی پھوٹتی رہی گی یہ چراغ جلتا رہے گا۔ یہ چراغ جلتا رہے گا........

دور سے اس لڑکی کی آواز آ رہی تھی... سورج غروب ہو رہا تھا۔ لیکن اس سانولی لڑکی کی جبیں پر کرنیں چمک رہی تھیں۔ اس کے سینے کے زیر و بم میں کوئی طوفان موجزن تھا۔ اس کے خاموش لبوں پر کوئی نئی حکایت تڑپ رہی تھی۔ لیکن وہ سب کچھ کہہ چکی تھی۔ آج اس کے ننگے ہاتھوں نے آنچل کو نہ سنبھال رکھا تھا۔ اس کا آنچل ہوا میں کسی سرکش پھریرے کی مانند لہرا رہا تھا۔ وہ گلی کے موڑ پر اوجھل ہو گئی۔ لیکن وہ میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ میرے ذہن کی تہوں میں حرکت کر رہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔ دور سے فیض دین کی آواز فضا میں اِرتعاش پیدا کرتی آ رہی تھی۔ وہ اپنی دردناک آواز میں گاتا جا رہا تھا۔

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی　∴　کیوں ترا راہگذر یاد آیا

رتنی واسطی

بھاگسوناتھ

ہری ہری گھاس، سرسبز درختوں، اور ننھے مُنّے آبشاروں میں گھری ہوئی کانگڑہ کی وادی میں آہستہ آہستہ اُبھرتی ہوئی دھرسالہ کی چوٹی، اور اُس کے نزدیک سے بہتا ہوا بھاگسوناتھ کا پوتر پانی، جو عین اُس کے سرے پر آبشار کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور جہاں ہزاروں پجاری، لاکھوں پیتے لوگ اشنان کی غرض سے ہر سال آتے ہیں۔ بالکل وہیں، اُس کے قدموں میں میرا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ زندگی مسرور رہتی تھی، اور ننھے مُنّے جھرنوں کی چنک، حسین پھولوں کی پیاری پیاری خوشبو، بہت سی عورتوں، مردوں، بچوں، بوڑھوں کی مسرت سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے میرے دل کو تسکین پہنچتی تھی، یہاں ہزارہا سال کی تہذیب دفن تھی، کچھ دفن تھی، کچھ عیاں، —— دن میں ہزاروں ایسے مواقع آتے، جب میں گویوں کے خوبصورت خوبصورت بچوں، پیاری پیاری عورتوں، اور بوڑھوں سے اس سرزمین کی لطیف اور ہلکی پھلکی کہانیاں سُنا کرتا۔ وہ مجھے راجپوتوں کی بہادری کی کہانیاں، اُن کے حسین معاشقے، ہولناک لڑائیوں کی داستانیں جب اپنی زبان میں سُناتے، تو میں ایک خاص قسم کی مسرت محسوس کرتا۔ جیسے میں بھی اُن بہادروں میں سے ایک ہوں۔ میرے سامنے کسی بہادر کی تصویر کھنچ جاتی، جب وہ کسی میدان میں دشمن سے لڑنے کو جا رہا ہوتا۔ اور اُس کی محبوبہ ایک نہایت سنگلاخ قلعے سے جھانکتے ہوئے اُسے الوداع کہہ رہی ہوتی، اور جب وہ بھی منہ موڑ کر اُسے دیکھنا چاہتا، تو اُس کی جھلک میں بھی دیکھ لیتا۔ اپنی شکل دیکھکر مجھے حیرت نہ ہوتی کیونکہ میرا حسین تخیل، یوں ہی اِن پیاری پیاری پہاڑیوں پر، ننھے مُنّے سنگریزوں پر، گنگناتے آبشاروں اور قریب ہی دھولا دھار کی چوٹی پر چمکتی ہوئی برف پر گھوما کرتا تھا۔ اور نہ صرف تخیل، بلکہ میں خود بھی دن دن بھر انہی چوٹیوں پر گُم رہا کرتا۔

پٹھانکوٹ سے جس وقت میں پہلی بار دھرسالہ کی موٹر میں سوار ہوا تھا۔ میرا دل مسرتوں سے جگمگایا ہوا تھا۔ میں ایسی وادی کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں بہت سے دیوتا تھے۔ جہاں جوالا مکھی تھی، جس پر اکبر نے سونے کا کلس چڑھایا تھا۔ جہاں وہ قلعہ تھا۔ جو کبھی محمود غزنوی نے فتح کیا تھا۔ جہاں نورجہاں کا بنایا ہوا نور پور کا قلعہ تھا۔ اور اس کے علاوہ کلو کی وادی، جہاں سیب تھے، بے پناہ سیب، سُرخ سُرخ، سُرخ و سپید، ترش و شیریں، اور بالکل اسی قسم کے اس میں بسنے والے فرشتوں سے سچے سچے لوگ، نورانی چہروں پر متانت لئے چلتے پھرتے لوگ —— یہی لوگ زندگی کی سچی تصویریں تھے۔

نور پور پہنچنے سے پہلے ہماری موٹر خوب تیز آئی تھی، ہمارا ڈرائیور ایک سکھ تھا۔ گو میں ڈر رہا تھا۔ کہ یہ کہیں کوئی حادثہ نہ کردے۔ کیونکہ کیا پتہ ہے، اکا۔ لیکن وہ بڑی سنجیدگی سے موٹر چلاتا رہا۔ نور پور میں نورجہاں کا بنایا ہوا قلعہ تھا۔ جس میں بہت سے دیوتا براجمان تھے؛ نورجہاں نے اس جگہ کو دیکھکر بے ساختہ کہا تھا۔

سہ کس قدر نزہت فزا ہے یہ مقام کوہسار
ہم بنا ڈالیں گے، اس جا، ایک حصارِ استوار

اور پھر میری آنکھوں کے سامنے وہ کہانی گھوم گئی کہ کس طرح یہاں کے راجہ کی چالاکی پر نورجہاں گلہڑوں والے آدمی دیکھکر اس جگہ کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئی تھی، لیکن جب ہماری موٹر وہاں ٹھہری، اور میں نے اس جگہ کے لوگوں کو دیکھا تو مجھے وہ کہانی غلط معلوم ہونے لگی۔ میں موٹر سے اُتر کر سڑک کے کنارے کے ساتھ ساتھ کافی گہرائی پر بہتے ہوئے ایک نالے کو دیکھنے لگا۔

پیشتر ازیں ہمیں ایک کافی بڑا نالا ملا تھا۔ جو ایک دریا کے برابر تھا۔ اُس کا نام "چکی" تھا۔ اور اُس کے نزدیک ڈلہوزی اور دھرم سالہ کے لئے موٹریں جدا ہوتی تھیں، وہاں ایک بند (Bassier) تھا۔ اور یہ نالہ بھی اُسی میں جا ملا تھا۔

ڈرائیور نے ہارن دیا۔ اور ہم سب موٹر میں سوار ہو گئے، گھومتی گھماتی سڑک ہمیں دھرم سالہ کی طرف لئے جا رہی تھی ارد گرد ہرے بھرے درخت تھے، ننھے ننھے کھیت تھے، اُن پر سبزی بے پناہ چھائی ہوئی تھی، ہم کوٹلے سے گذرے، جہاں ایک نالے پر بہت بڑا پُل تھا۔ اور نزدیک ہی پولیس کی چوکی تھی، ہمارا دوسرا قیام "شاہ پور" پر ہوا۔ یہاں ہم کچھ دیر ٹھہرے، میں نے تھوڑے سے آلوچے لئے، اور اُن کو کھانے لگا۔ کھاتے کھاتے میں نے وہاں کے کچے مکانات، چھوٹی چھوٹی بدنما سی دوکانیں، جب دیکھیں، تو میں سوچنے لگا کہ یہاں سے ہزاروں لوگ روز گذرتے ہیں، موٹروں میں، کاروں میں، موٹے موٹے پیٹ والے راجے، اور رئیس، پھٹے پرانے کپڑے پہنے، ننگے پیر اور بھوکے لوگ، یہ عمارتیں اُنہیں دیکھتی رہتی ہیں، لیکن وہ ان کی طرف کبھی غور نہیں کرتے۔ واقعی یہ دیوتاؤں کی سرزمین ہے۔ یہاں پر ایک نامعلوم سی ہیبت، ایک خاص وقار در و دیوار سے ٹپک رہا ہے۔ اور مجھے یہ محسوس کرکے ایک مسرت سی ہوئی، کہ میں ایسی جگہ جا رہا ہوں، جہاں مجھے مکمل سکون ملے گا۔ اور میری روح کو تسلی اور آرام میسر آئیگا۔

وہاں سے چلکر ہم "گگل" پہنچے، یہاں سے موٹریں پھر دو تین جگہ کے لئے جدا ہوتی تھیں، ایک تو کانگڑہ کو جو نگروٹہ کو جاتی ہوئی مین اُس قلعے کے سامنے جاتی تھی، جو محمود غزنوی نے فتح کیا تھا۔ اور جہاں اب پھر بہت سے دیوتا ہیبت و وقار سے کھڑے تھے۔ گو کچھ پا بُریدہ تھے، اور کچھ سر شکستہ۔ اور کچھ موٹریں کلو کی طرف جا رہی تھیں، جنہیں جوالا مکھی، جو گندر نگر وغیرہ ہوتے ہوئے جانا تھا۔ اور اُس سے آگے چل کر چیتڑو کے قریب سے ایک سڑک پالم پور کی طرف بھی جاتی تھی۔

چیتڑو سے نکلکر دھرم سالہ کے موڑ شروع ہو گئے، سامنے دھولا دھار پر برف چمکتی نظر آنے لگی، اور موٹر اپنا تمام زور لگا کر چڑھائی چڑھنے لگی۔ اور مجھے محسوس ہونے لگا۔ کہ میں اسی طرح چڑھتے چڑھتے آسمان کی بلندیوں کو جا چھوؤں گا۔ سڑک کے ساتھ ساتھ ہی وہ نالا بہہ رہا تھا۔ جو "بھاگسوناتھ" کے پوتر پانی کو اپنے دامن میں لئے ہوئے تھا۔ اُس میں بھی وہی دیوتاؤں کا سا وقار اور متانت تھی، نہایت سنجیدگی سے، ہولے ہولے، دنیا کی ہماہمی اور موٹر کے چیخنے کی پرواہ کئے بغیر گذرا چلا گیا ہزاروں موٹریں یہاں سے اسی طرح گذرتی ہیں، اُس کے لئے کوئی نئی بات تو نہ تھی، اب ہم ایسے موڑ سے گزر رہے تھے، جہاں اٹلی کے قیدیوں کا قبرستان تھا۔ وہ قیدی دھرم سالہ کے قریب "یول کیمپ" میں رکھے گئے تھے، جہاں وہ یقیناً اپنے وطن اور اپنے گھروں کے حسین خواب دیکھتے ہوں گے ـــــ اور میرے سامنے اُن کے مکانوں کی تصویریں کھنچ گئیں، اُن کے ننھے ننھے بچے ہاتھ پاؤں ہلا ہلا کر اپنی امی سے اپنے ابا کے بارے میں پوچھ رہے تھے، اور وہ کہہ رہی تھی، ـــــ "بیٹا، تمہارے ابا بہادر ہیں، جنگ میں لڑنے گئے تھے، وہاں گرفتار ہو گئے، اور اب ہندستان میں ہیں۔ اب جبکہ جنگ ختم ہو گئی ہے وہ عنقریب ہی آتے ہوں گے۔ میں تجھے خوب سجا کر بندرگاہ پر لے جاؤں گی۔ اور وہ تجھے دیکھتے ہی اُٹھا لیں گے۔ اور تو بھی اُنہیں "ابا۔ ابا" کہہ کر چمٹ جانا ـــــ" اور ایک نامعلوم جذبہ کے ماتحت اُس نے بچے کو چمٹا لیا۔ اور اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ یکایک میری توجہ بہت سے لوگوں پر پڑی۔ وہ سارے اٹیلین تھے، اور کسی قیدی کا جنازہ لائے تھے، میرے دل کے ایک کونے سے آواز آئی، کہیں یہ وہی بدنصیب تو نہیں، جس کا انتظار اُس کی بیوی، اور اس کا بچہ کر رہے ہیں۔ اور میرا دل بیٹھ گیا ـــــ اور مجھے اس عورت کی آنکھوں میں ننھے ننھے آنسو لرزتے نظر آنے لگے، وہ آنسو، جو اُس کے لئے خوشی اور موت دونوں کا پیش خیمہ تھے۔

پھر ہمارے سامنے گورنمنٹ کالج کی عمارت پھرنے لگی، اور یہاں سے کوٹھیاں شروع ہو گئیں، وکیلوں کی، پروفیسروں کی اور انہی میں ایک کوٹھی کالج کے پرنسپل کی بھی تھی، لیکن موٹر ان سب چیزوں سے بے نیاز بڑھتی چلی جا رہی تھی، موٹر کچہری کے نزدیک رُکی

وہاں کچھ لوگ اترے۔ اور بہت سے سکول کے بچے اس میں سوار ہونے کو دوڑ پڑے، بہت سے "ہاتھو" اور "گدی" "سامان" اٹھانے کی غرض سے بھاگے آئے ـــــ ایک نے مجھ سے بھی پوچھا "بابوجی کوئی سامان ـــ؟" میں نے کہہ دیا "ابھی مجھے اوپر جانا ہے" سب کے چہروں پر یکساں خوشی تھی، ہنستے کھیلتے موٹر میں چڑھے آ رہے تھے، اور ہمارا سکھ ڈرائیور اپنے چند دوستوں سے ہنستے ہوئے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے یہ سب میرے دوست ہوں، میرے واقف کار ـــ بہت پرانے جان کار ـــ اور یہاں پر کچہری کی عمارت کے ساتھ ساتھ بہتی ہوئی نالی کے عین سر پہ، ہری ہری باڑ تھی، اور دوکانیں تھیں، چھوٹی موٹی، لیکن صاف شفاف ـــ میرے پاس ایک بچہ آکر بیٹھ گیا۔ اور میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ اس کا نام دلیپ تھا۔ اور وہ یہاں کے افسر جنگلات کا لڑکا تھا۔ اس کا پیارا پیارا چہرہ اور میٹھی میٹھی باتوں میں میں کھو گیا۔ سکول سے چھٹی ملنے پر کچھ لڑکیاں بھی چلی آ رہی تھیں، کناروں پر کھڑے ہوئے آلوچوں اور آڑوؤں کے درختوں میں پھول آئے ہوئے تھے، اور جب میں نے گردن باہر نکال کر دیکھا، تو بہت سے پھلوں کے درخت نظر آئے جھنڈ کے جھنڈ ـــ!

سواریاں اتر چکی تھیں سب بچے اور لڑکیاں بیٹھ چکے، کلینر اپنے بیٹھنے کے لئے جگہ بنا رہا تھا۔ اور ڈرائیور اپنے دوستوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے موٹر میں بیٹھ رہا تھا، اور میں دلیپ سے باتیں کر رہا تھا ـــ پیارا بچہ .....!!

موٹر چل پڑی، اور پھر پوسٹ آفس کے نزدیک ٹھہری، یہاں کلینر نے ڈاک دی، اور بہت سے کالج کے لڑکے جو بچوں کی نسبت جوان تھے، اور جو کچہری کی بجائے پوسٹ آفس کے نزدیک سوار ہونا پسند کرتے تھے، ہماری موٹر میں چڑھ آئے، سیدھے سادے لڑکے تھے، نہ انھوں نے بھڑکیلے سوٹ پہن رکھے تھے۔ اور رنگ برنگی ٹائیاں باندھ رکھی تھیں، اور نہ وہ اکڑ اکڑ کر باتیں کرتے تھے، ان کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے، سادی سادی باتیں، اور کھیلتے ہوئے چہرے دیکھ کر میں خوش ہو رہا تھا کچھ لڑکے بھاگے آ رہے تھے، مگر موٹر میں جگہ نہ ہونے کے باعث ٹھہر جاتے، لڑائی جیسے وہ جانتے ہی نہ تھے۔ چپ چاپ کھڑے مسکراتے تھے، کچھ سواریاں یہاں بھی اتری تھیں۔ پوسٹ آفس کے نزدیک ہی تھانہ تھا۔ اور اس کے ساتھ سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک اور راستہ تھا، جو نیچے بازار میں جاتا تھا۔ پھر جب ہم چلے ہیں تو سول ہسپتال، اور اسی قسم کی دوسری عمارتوں کو دیکھتے ہوئے ہم "قینچی موڑ" سے بھی گذرے۔ یہ بالکل قینچی کی شکل کا تھا۔ دلیپ نے مجھے بتایا کہ یہ بہت مشہور موڑ ہے۔ اور اس سے آگے "چیل گاڑی" ہے، جہاں گورکھوں کی کافی آبادی ہے۔ اور چیلوں کے کافی جھنڈ ہیں۔ بچے لکڑی کی بنی ہوئی گاڑیوں میں نیچے کی طرف لڑھکتے چلے آ رہے تھے؛ بلکہ کچھ نوجوان بھی اسی طرح کی گاڑیوں پہ بیٹھے لڑھک رہے تھے۔ اور میں ان لوگوں کی سادگی، اور بھولے پن پر مسکرا رہا تھا۔ پھر ہم مین بازار میں داخل ہو گئے۔ بہت سی دوکانیں تھیں، اور مختلف قسم کی۔ گاڑی ٹھہر گئی، میری منزل آ گئی تھی، میں چاہتا نہ تھا کہ اتنی جلد منزل آ جائے مگر مجھے اترنا پڑا۔ اور ایک "ہاتھو" سے سامان اٹھوا کر گھر کی طرف چل دیا۔ دلیپ راستے میں ہی اپنی کوٹھی کے نزدیک اتر گیا تھا۔ میں بازار میں دوکانوں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ سکھوں کی دوکان، کپڑے والے کی دوکان، باٹا شوز، ریڈیو والے کی دوکان، حلوائی، سبزی فروش، بنک، غرضیکہ اس مختصر سی جگہ میں سبھی کچھ تھا۔

قصائی کی دوکان بھی، لیکن بڑے گوشت کی کوئی دوکان نہ تھی، ہاں، بکری کا گوشت عام بکتا تھا۔ کیونکہ سبھی کھاتے تھے، اسی طرح سؤر کے گوشت کی کوئی دوکان نہ تھی، ہندو سکھوں، اور مسلمانوں کے بچے گلے میں باہیں ڈالے، کھیلتے پھر رہے تھے۔ کچھ مسلمان سکھ سبزی فروش سے سبزی لے رہے تھے، اور ایک سکھ مسلمانوں کی دوکان سے کچھ آرائش کا سامان خرید رہا تھا۔ ذرا نیچے بازار کے خاتمے پر ایک مسجد تھی، اس سے نیچے ایک گوردوارہ تھا، اور مندر دوسری طرف تھا۔ میرے مسرور دل کی طرح ہر چیز حسین اور مسرور تھی، اور اس حسن، مسرت، سکون اور قدرت کی رنگینیوں کو دیکھ کر میں نے مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ اپنی تمام زندگی یہاں ہی گزار دوں گا ـــ"

اور واقعی میں نے زندگی کے تین سال گزار دیئے۔ اور اس تمام عرصہ میں میں نے اس سرزمین کے چپہ چپہ کو ٹٹول ڈالا۔ اونچی

اونچی چوٹیوں پر چڑھا۔ گہرے گہرے کھڈوں میں گھوما۔ اودی اودی گھٹاؤں سے باتیں کیں۔ برستی بارش، کڑکتی بجلی اور چھوٹے چھوٹے بڑے بڑے ادوں کی کہانیاں سنیں۔ کھلتے پھولوں مسکراتے غنچوں، گنگناتے آبشاروں، مسرور سنگریزوں اور خندان پتھروں کی خوشی میں، میں نے خوشی پائی۔ اکثر چاندنی راتیں ـــ "چوران" کے خاموش ترنم ـ متین اور سنجیدہ پانی کی روانی دیکھتے گزرتیں، "چوران" وہ نالا تھا جو میرے مکان کے نزدیک سے گزرتا تھا۔ اور جس میں بھاگسوناتھ کا پوتر پانی آتا تھا۔ برفوں میں، میں اچھلا کودتا، "تریونڈ" "دھرم کوٹ" اور "علاقہ" تک چلا جاتا۔ اور جب گہری گہری گھٹائیں آتیں، تو میں ان گھٹاؤں کو دیکھتا ـ اونچی اڑتی ہوئی بگلوں کی قطاریں، اور درختوں پر انواع واقسام کے پرندے، رنگ برنگ کے، خوبصورت چھوٹے چھوٹے پرندے، اور اُن کے دیوتاؤں کی خدمت میں گائے ہوئے نغمے، موسیقی کی اونچی نیچی تانیں ـــ میری روزمرہ زندگی کی خوراک تھیں، مجھے یہاں کے پہلوں، یہاں کے درختوں سے محبت تھی، میں "ڈینگ" کھانے میں اسی طرح کی لذت محسوس کرتا تھا جیسی یہاں کے لوگ کرتے تھے، میں اکثر چیلوں کے جھنڈ میں گھنٹوں بیٹھا با کرتا، "گھسیارے" اور "ڈاڑھی" کے میلے میں ناچتے کودتے گدیوں کو دیکھ کر، دل بھی اسی طرح ناچنے کودنے اور مسرور رہنے کو چاہا کرتا۔ اور میں گھر آکر اُن کی نقل اُتارنے میں خوش ہوتا۔

ہاں مجھے "جھول" سے نفرت تھی۔ جو وہ کبھی کبھی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے پیا کرتے تھے۔ کالاپل۔ عام سیرگاہ تھی۔ شام کے وقت بہت سے لوگ، جن میں بچے، عورتیں، جوان، مرد، بوڑھے اور لڑکیاں سب ہی شامل ہوتے تھے۔ وہاں تک سیر کو جاتے اُس سے اوپر فورسیٹ گنج کو راستہ جاتا تھا۔ اور وہاں سے میکلوڈ گنج پہنچ جانے کے بعد ہم بھاگسوناتھ کے قدموں میں ہوتے، میکلوڈ گنج میں اچھی بڑی عمارتیں تھیں، چند رئیسوں کی کوٹھیاں تھیں۔ اور میں بھاگسوناتھ کے کنارے بیٹھا گھنٹوں شیر دہن کے منہ سے نکلتا ہوا سفید سفید اور ٹھنڈا پانی دیکھا کرتا۔ کئی بار میں اس میں نہایا بھی تھا۔ حالانکہ وہاں لکھا ہوا تھا۔ کہ "یہاں غیر ہندوؤں کو نہانا منع ہے" لیکن وہاں سکھ، انگریز، اور مسلمان بھی نہاتے تھے، پھر بھی وہاں یہی لکھا ہوا تھا، اور اگر مجھے وہاں کسی چیز سے دکھ پہنچا تو وہ صرف اسی بورڈ سے ـــ اور اسی وجہ سے کبھی کبھی میں اس سے کچھ دور آگے نکل کر سلیٹ کی کان کے نزدیک آبشار کے کنارے جا بیٹھتا۔ اور کافی اونچائی سے گرتی ہوئی موٹی دھار کو دیکھتا۔ پھر اس میں کنکر ڈالا کرتا۔ اِس قسم کے شغل کرکے نجانے کیوں مجھے ـــ بے پناہ روحانی مسرت حاصل ہوتی۔

اور پھر میرے بہت سارے دوست بن گئے۔ رامند سنگھ، رگھبیر سنگھ، کھیم چند، مجید، اسلم، من موہن اور بالی ـــ ہم سب اکٹھے ہوتے۔ اکٹھے کھاتے پیتے۔ کھیم کالج کے لڑکوں کا سرغنہ تھا۔ زبردست کانگریسی، لیکن عدم تشدد کا پرستار۔ مجید اور اسلم کٹر مسلم لیگی تھے، من موہن اور بالی اور رگھبیر راشٹریہ سنگھ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور رامند سنگھ کو ماسٹر تارا سنگھ پسند تھے۔ میں خود دوست سب کا تھا۔ لیکن قائد اعظم اور پاکستان پر ایمان رکھتا تھا۔ الیکشن کے دنوں میں ہم نے خوب چوٹیوں پر نعرے لگائے تھے، پتھروں پر پاکستان زندہ باد لکھا تھا۔ اور کھیم وغیرہ نے کانگریس زندہ باد کے نعرے لگائے تھے۔ لیکن اِس کے ساتھ ہی ساتھ ہم سب ایک تھے، بالکل ایک ـــ ہم اکٹھے گھوما کرتے، اور ہمیں ایک دوسرے کی دوستی پر ناز تھا۔

اور پھر مجھے دھرم سالہ کی محبت کے ساتھ ساتھ دھرم سالہ میں بسنے والی ایک حسین اُپسرا سے بھی اُلفت ہو گئی، وہ میری زندگی میں کس طرح داخل ہوئی، کب ہوئی، اس کا نہ مجھے علم ہے۔ اور نہ اُسے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے، پیار کرنے لگے، اُس کا نام "دُلاری" تھا۔ وہ ایک راجپوت کی لڑکی تھی، وہ اُسی دیپ کی بہن تھی، جو مجھے پہلے دن موٹر میں ملا تھا، اور جس پر مجھے پہلی پیار آیا تھا۔ ہم دونوں ساتھ رہتے، ہنستے، کھیلتے، جھرنوں کے کنارے بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔ پیاری پیاری، بھولی بھولی، ـــ ہم نے کبھی سیاست کے بارے میں گفتگو نہ کی، کبھی مذہب کو درمیان میں نہ لیا۔ ہم صرف اپنے سے متعلق باتیں کیا کرتے، ہم خود غرض ہو گئے تھے، دنیا ہماری نظروں کے سامنے سے ہٹ گئی تھی، اور ہم بھول گئے تھے، کہ کہیں دور کچھ لوگ اور بھی بستے ہیں، اور ایک بستی اور بھی ہے

جس کا نام ونیل ہے۔

دُلاری نے میری زندگی میں تلاطم پیدا کر دیا تھا۔ ایک سکون، ایک ٹھہراؤ تھا، جس میں ہلکا سا کنکر گرا، اور دور تک چکّر سے بنتے چلے گئے۔ میں اس میں، اور وہ مجھ میں مدغم ہوتی چلی گئی۔ ہم نے کبھی مستقبل کے حسین خواب نہ دیکھے، کبھی اَن ہونی باتوں کی قسمیں نہ کھائیں۔ کبھی ساری عمر ایک ہی بندھن میں جکڑے رہنے کی خواہش نہ کی بلکہ ہمارا ہر دن، ایک نئی اُمنگ کو لیکر آتا۔ اور شام ہونے کے ساتھ وہ اُمنگ بھی مرتی چلی جاتی، ہر سورج جو طلوع ہوتا۔ ایک نئی دلچسپی اپنے ساتھ لاتا۔ کیونکہ ہمیں علم تھا۔ کہ اس قسم کی بے سود باتیں کسی کام کی نہیں، بعد میں سماج کو رونے پیٹنے سے کیا حاصل۔ جتنی زندگی مسرت میں گزر جائے، اچھی ہے۔ اور جب غم شروع ہو جائیں۔ تو انسان بخت ہو کر بیٹھ جائے۔ کبھی جب خوشی دیکھی ہے۔ تو غم بھی دیکھو۔ اگر سارا دن ہنستے رہو۔ تو تھوڑا سا بسور کر بھی دیکھو——— اور یوں ہی زندگی گذرتی چلی جا رہی تھی۔

اور دوسری طرف کیبنٹ مشن آیا۔ لارڈ ویول چلے گئے، ماؤنٹ بیٹن بہت اُمیدیں لیکر آئے۔ ہندوستان کو آزادی دینے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ہم خوش تھے سبھی خوش تھے۔ مگر جب پنجاب میں خضر وزارت نے استعفےٰ دیا تو۔ اور ماسٹر تارا سنگھ نے پاکستان مُردہ باد کا نعرہ لگا کر اسمبلی چیمبر کے سامنے تلوار لہرائی، تو ایک دم مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں میں ایک بے پناہ جوش اور جذبۂ نفرت پیدا ہو گیا۔ جلسے ہوئے، جلوس نکلے، نعرے لگے، اور کشت و خون شروع ہو گیا۔

دھرم سالہ بھی اس دست بُرد سے کس طرح بچتا۔ وہاں بھی یہ آگ بڑھنے لگی پہلے دن جلوس نکلا۔ تو تمام ہندو سکھ عورتیں، مرد اور بچے اس میں شامل تھے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے "پاکستان مردہ باد" "خون کا بدلہ خون سے لیں گے" "یاد ہری سنگھ نلوہ" اور اسی قسم کے بہت سے نعرے۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ نظارہ گھوم گیا۔ جب آئی۔ این۔ اے کا جلوس نکلا تھا۔ مسلم لیگ اور کانگرس کے جھنڈے ساتھ ساتھ تھے۔ اور ہم جوش میں آکر نعرے لگا رہے تھے——— "لال قلعے سے آئی آواز، سہگل ڈھلوں، شاہنواز" ——— "انقلاب زندہ باد" اور اسی قسم کے دوسرے نعرے، جس میں پیار، محبت، اور اتفاق کی بھینی بھینی خوشبو تھی، لیکن اب جب یہ "خون کا بدلہ خون سے لیں گے" والا نعرہ میں نے سُنا۔ تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یا خدا! کیا انسان اتنی جلد بدل جاتا ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں، لیکن اتنے سارے دل کس طرح یکلخت پھر سکتے ہیں ———؟

دُلاری جو میری اپنی تھی، جلوس میں سب سے آگے کانگرس کا جھنڈا پکڑے جا رہی تھی، کل نے اکالیوں کا جھنڈا تھام رکھا تھا۔ اور مسلمان سہمے ہوئے جہاں تھے، وہاں تھے، بھلا ایسی حالت میں اور کیا ہی کیا جا سکتا تھا۔ جہاں صرف ۵۔ فیصدی مسلمان آبادی ہو۔ جلسہ ہوا، اور اس میں دھواں دھار تقاریر ہوئیں۔

پھر پندرہ اگست کو آزادی دیئے جانیکا اعلان ہوا، پنجاب میں مسلم لیگ کی وزارت نہ بن سکی۔ اور جنگل کا راج شروع ہوا۔ تو یہاں کی فضا بھی نکھرنے لگی۔ دُلاری جب مجھ سے ملی۔ تو میں نے اُس سے اس نظریں پھیر لینے کا سبب پوچھا۔ کہنے لگی "ہم اپنی ماتری بھومی کے ٹکڑے نہ ہونے دیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ تو ایک اٹل امر ہے، جو ہو کر رہیگا۔ اس طرح سے دونوں خوش رہیں گے۔ مسلمان بھی، اور ہندو بھی۔" کافی دیر بعد پوچھنے لگی "مگر تم کہاں رہو گے" میں نے کہا۔ "آزادی ملنے کے بعد میں آزاد شہری کی حیثیت سے یہیں رہونگا۔" اور وہ خوش ہو گئی، ہم سب پھر گہرے دوست تھے۔

۱۵ اگست کو ترنگے جھنڈے لہرائے گئے، میرے دل میں کتنی خواہش تھی، کہ میں اپنا ہلالی نشان لہراؤں، جس کی خاطر ہم اتنا لڑے تھے۔ مگر ادائیگی فرض اور ضمیر نے اجازت نہ دی۔ پاکستان ریڈیو سے خوشی کے ترانے سُنے، ہندوستان ریڈیو سے آئین ساز اسمبلی میں ہونے والے جشن کی کہانی سُنی، پنڈت جواہر لال نہرو، اور قائد اعظم کے پیغامات سُنے۔ اور ایک خوش آئند

مستقبل کی امید میں مسرور ہوگیا۔ اور یہ زندگی کی سب سے پہلی اور شاید آخری بھول تھی ــــــ

یوں تو ہندو سکھ پناہ گزین کافی عرصہ پہلے سے آنا شروع ہوگئے تھے۔ اور مغربی پنجاب میں ہونے والے واقعات نے نہ صرف یہاں کے ہندو سکھوں، بلکہ مسلمانوں تک کے دل پگھلا دیئے تھے۔ ہمیں بتایا جاتا تھا۔ کہ جالندھر، لدھیانے، فیروزپور، امرتسر وغیرہ میں جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے۔ وہ مغربی پنجاب کا ردّ عمل ہے۔ اور ہم حیران تھے کہ یا خدا! ان انسانوں کو، اس اشرف المخلوقات کو کیا ہوگیا ہے۔؟ اس کے منہ کیوں خون لگ گیا ہے؟ لیکن کیا معلوم تھا کہ یہ انسانی خون پینے کی عادت موروثی ہے۔ اور ہم ہندوستانی لکیر کے فقیر، بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے پر مجبور ہیں،

مغربی پنجاب میں ستائے ہوئے ہندو سکھ آتے۔ اور اپنی کہانیاں، اپنی بپتا سنایا کرتے۔ اور لوگوں کی ہمدردی کا اس طرف مبذول ہونا عین فطری امر تھا۔ لیکن اس کے باوجود، اس دیوتاؤں کی سرزمین میں رہنے والے دیوتا نہایت سکون میں تھے۔ اور ان میں مطلق بھی جوش یا ہیجان نہ پایا جاتا تھا۔ ان کے ہر کام میں متانت اور سنجیدگی گھلی ہوئی تھی۔ لیکن ۸ اگست کو جب ہم عید کی نماز پڑھنے گئے۔ تو ہمیں آزاد ہونے پر مسرور رہنے کے ساتھ ساتھ ایک نہ معلوم خطرے سے بھی آگاہ کیا گیا۔ اور بتایا گیا کہ وہ آگ جو تمام پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لئے بھڑک رہی ہے۔ عنقریب ہی دھرم سالہ کی حسین وادی کو جلا کر راکھ کردے گی اور ہمیں اس وقت کا منتظر رہنا چاہئے ــــ مسلمانوں کی مختصر سی جماعت گھبرا گئی۔ لیکن سب نے متفقہ فیصلہ کیا۔ کہ ہم حکومت کے وفادار شہری کی حیثیت سے یہیں رہیں گے۔ اس جگہ کو نہیں چھوڑیں گے۔ اور چھوڑ کر جا بھی کہاں سکتے تھے۔ راستے تمام مسدود تھے۔ اور یہ فیصلہ دھرم سالہ کے لیڈروں کو بھی بتا دیا گیا۔ لیکن نفرت کی وہ آگ جو دھیرے دھیرے ان کے دلوں میں بھڑک رہی تھی، سرد نہ ہوئی۔

اور ۲۰ اگست کی شام کو جب ایک موٹر پٹھانکوٹ سے آئی، اور اس میں سے ایک سکھ نے اتر کر سیالکوٹ میں ہونے والے واقعات کی درد بھری داستان سنائی۔ تو یک دم ہی آگ لگ گئی۔ اس نے روتے پیٹتے ان لوگوں کو غیرت دلائی۔ کہ دیکھو وہاں انھوں نے عورتوں کا ننگا جلوس نکالا۔ انھوں نے بچوں کو بڑی بے رحمی سے ذبح کیا۔ بوڑھوں مردوں، اور عورتوں کو بڑی بے دردی سے مارا۔ عورتوں کی بے حرمتی کی۔ تو کون ایسا بے حس انسان تھا۔ جو ان باتوں سے اشتعال میں نہ آتا ــــ اور میں مجبور ہوگیا۔ کہ اپنے گھر کو بجنسہ چھوڑ کر اپنی ہم جنس بھیڑوں میں آملوں۔ جو سب امام باڑے میں جمع ہوگئے تھے، دوسرے لمحے ہمیں گاؤں، مکان، اور کوٹھیاں جلتی نظر آنے لگیں۔ "یہ دارھی" جل رہی ہے۔ وہ ماسٹر فضل دین کی کوٹھی میں آگ لگی۔ اور جب میں نے اپنے پڑوسی کو اپنے مکان سے سامان اٹھا کر بھاگتے دیکھا۔ تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس لئے نہیں کہ وہ میرا سامان تھا۔ میری کتابیں تھیں، میرا ریڈیو تھا، اس لئے نہیں کہ وہ میرا مکان تھا، میرا کیا ہے، اکیلا انسان، جہاں گیا وہیں دنیا بسالی۔ بلکہ اس لئے کہ وہ دیوتاؤں کی سرزمین میں رہنے والا پوتر انسان ایسا فعل کیوں کر رہا ہے۔؟ کیا اسی کا نام تغیر ہے کیا اسی کو انقلاب کہتے ہیں۔ جس کے نعرے ہم لگایا کرتے تھے، ــــ؟؟؟

اور میں مختلف خیالات کے ہجوم میں گم ہوگیا۔ اور اس وقت تک بیدار نہ ہوا۔ جب تک "ونگر کوٹ" (نگرکوٹ) کانگڑہ، نورپور، چمبہ، داکھنگل، وغیرہ سے بچے، عورتیں، مرد، بوڑھے، لڑکے لڑکیاں، روتے پیٹتے، ننگے، بھوکے، زخمی، بلکتے ہوئے نہ پہنچے۔ یہ لوگ ویسی جگہوں سے آئے تھے۔ جہاں پر* ــ محمود غزنوی کا فتح کیا ہوا قلعہ تھا۔ اور جہاں بہت سے بت اب تک مسلمانوں کی ہیبت دل میں بٹھائے موجود تھے۔ یہ اس نگرکوٹ سے آئے تھے، جہاں محمود تغلق آیا تھا، یہ سی جوالامکھی سے، شندے تھے، جہاں اکبر نے عقیدت میں سونے کا کلس چڑھایا تھا۔ یہ وہی نورپور تھا، جو نورجہاں کو پسند تھا۔ اور جہاں وہ شہر بنا دینا چاہتی تھی اور یہ سب وہیں جمع ہو رہے تھے، جہاں اس وقت آگ کے شعلے آسمان کو چھو رہے تھے۔ خون ہو رہے تھے، اور جہاں اب بھی

* [illegible]

بھاگسو ناتھ کا پوتر پانی وہی پوتر تا نچھاور کر رہا تھا۔ لیکن بے سود ــــــ جہاں میں نے عہد کیا تھا۔ تمام عمر گذار دینے کا۔ اور جہاں میری دُلاری رہتی تھی، جو ایک دیوی تھی، پاک اور پیاری۔ پیاری دیوی۔

اور جب ہمیں دھرم سالہ سے بھیڑوں کی طرح ہانک کر یول کیمپ لے جایا گیا تو۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا۔ جیسے بھاگسو ناتھ کا پانی کراہ رہا ہے۔ دھرم سالہ کے مکانات نہیں جل رہے۔ بلکہ وہ لال لال خون میں رنگے ہوئے آنسو ہمارے وداع ہونے پر بہا رہے ہیں۔ اُس کی سڑکیں خون سے سُرخ نہیں۔ بلکہ وہ بھی خون کے آنسو رو رہی ہیں۔ دُلاری کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں۔ وہ واقعی رو رہی تھی، مجھ سے جُدا ہونے پر نہیں۔ بلکہ نسانیت کے اس قبیح فعل پر ــــــ اور میرا جی چاہا کہ اُسے ایک بار چمٹا کر یہ ضرور بتا دوں، کہ اے پیاری دیوی! تو کیوں فکر کرتی ہے۔ انسان وقتی طور پر بے وقوف ہو جاتا ہے ذرا دیکھ تو اس سبزی کو، اِن چشموں کو، اِن سنگریزوں کو، اِن پرندوں کو ــــــ کیا ہُوا ہے، جوان سَرو یا فسانوں کے چہروں پر اب غم و غصّے کے آثار ہیں۔ اِن کے سر پر خون کھیل رہا ہے۔ لیکن تجھے تو معلوم ہی ہے۔ کہ وہ دن ضرور آئیگا جب کہ یہ لوگ پچھتائیں گے۔ اور ہم بھاگے ہوئے اِن سے گلے ملنے کو دوڑے آئیں گے۔ وہ پیار و راچیوت پھر پیدا ہوں گے۔ اکبر پھر دوبارہ جوالا مکھی پر کلس چڑھانے آئیگا۔ اور وہ کلس سونے کا نہ ہوگا۔ یہ تو محض ایک معمولی سی دھات ہے۔ بلکہ وہ اخوت، محبت اور پیار کا ہوگا۔ اور وہ پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جگمگایا کریگا ــــــ بے وقوف لڑکی، رو رہی ہے، تو ــــــ نہ اور مجھے محسوس ہُوا، کہ وہ مسکرانے لگی، ایک تلخ سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔ اور اُس کے شیریں ہونٹوں پر یہ تلخی مجھے بہت بُری طرح محسوس ہوئی۔

یول کیمپ وہی تھا، جہاں میں پہلے بھی کئی دفعہ آیا تھا۔ جہاں اٹلی کے قیدی تھے، مگر اب وہ جا چکے تھے۔ ایک پنچھی اُڑ گیا تھا۔ دوسرا آگیا تھا۔ لکڑی کی بنی ہوئی بہت سی بارکیں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں۔ اور بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور جوانوں کے رونے پیٹنے کی آوازوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اُن قیدیوں کی روحیں، جو یہاں مرے تھے، اپنے لواحقین کے ساتھ، جو اپنے وطن میں تھے، مل کر رو رہی ہیں، اور اُن کی چیخوں سے آسمان تک دُھلا جاتا ہے۔ وہ ماں جو اپنے بچے کو مستقبل میں اُس کے باپ سے ملانے کو کہتی تھی، اب بھی اپنے بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ مگر اب وہ خلاء میں نہ جانے کیوں گھور رہی تھی ــــــ؟

اور سب کے عزیز آگئے تھے، لیکن اُس کے دیوتا ہی نہ آئے تھے، وہ دیوتاؤں میں جا ملے تھے ــــــ اور اُس کی کٹوری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، اور میں مضطرب ہوگیا۔ شاید یہ اُفتاد جو ہم پر پڑی، اُس کی آہ و بکا کا ہی اثر ہو۔

اور جب ہم کانوائے میں (ESCORT) کے ساتھ پاکستان آ رہے تھے، تو راستہ میں ہمیں وہ تمام مقامات ملے۔ جو کبھی خوشی اور مسرت کا گہوارہ تھے، لیکن آج وہاں موت کی تاریکی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک بے وجہ سی گھبراہٹ اور غیر ضروری بے چینی پھیلی ہوئی تھی "چکی" بدستور بہہ رہا تھا۔ لیکن اُس کا پانی رنگین تھا۔۔۔ ۵ گوجروں کے خون سے رنگین تھا۔ جن کے سرد سرد لاشے، گرم گرم خون اس میں گرا تھا۔ لیکن شرم سے سر جھکائے بہا چلا جا رہا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ بھاگسو ناتھ کا پانی زور زور سے پتھروں سے سر پٹک رہا ہے۔ اور کراہ رہا ہے۔ نور پور کا نگڑہ اور نگروٹے کے قلعے منہ جھکائے ندامت میں کھڑے ہیں۔ جوالا مکھی کا کلس شرم سے پانی پانی ہُوا جاتا ہے چشمے، سبزہ، سنگریزے، پتھر، چوران، میرا مکان، دُلاری، بھیم، رامندر، رگھبیر، بالی اور من موہن، سبھی رو رہے ہیں۔ اور دھرم سالہ میں بسنے والے کچھ لوگ مسرور ہیں۔ اور کچھ رو رہے ہیں۔ لیکن مجھے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا۔ کہ یہ لوگ جو اب مسرور ہیں۔ ضرور روئیں گے۔ کیونکہ یہی قانونِ فطرت ہے۔ وہ ضرور پچھتائیں گے۔ اور ہم ضرور اس وادی میں واپس آئیں گے

(باقی صفحہ ۴۸ پر ملاحظہ فرمائیے)

ابراہیم یوسف

لاش کے گرد

یہ ان چھوٹے چھوٹے کوارٹروں میں سے ایک کوارٹر کی کہانی ہے جو عالیشان کوٹھیوں کے پاس اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ اِن میں رہنے والے کوٹھی کے حُسن ظاہری کو برقرار رکھنے کے علاوہ کوٹھیوں میں رہنے والوں کی خدمت بھی کرسکیں ——

یہ ایک اسی رات کی کہانی ہے جبکہ تاریکی کا دیوتا اپنے پر پھیلائے ہوئے تھا اور ہوا کے دیوتا کی خوفناک سانسیں اس قدر تیز ہوگئی تھیں کہ کوارٹر میں جلتا ہُوا دیا خوف سے کانپ رہا تھا اور گرج اور چمک کا دیوتا اپنے جلال کا آخری مظاہرہ کر رہا تھا ——

یہ ۷-۸ سالہ معصوم طاہرہ کی کہانی ہے جس کے چہرے کی معصومیت پر اُداسی اور پریشانی کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور جو اپنی ماں کی پٹی سے لگی اس کے کراہنے کی آواز سن رہی تھی —— یہ بیس اکیس سالہ مفلوج زینت کی کہانی ہے جس کی رگ رگ سے جوانی پھوٹی پڑ رہی تھی مگر قدرت نے جس کو مفلوج بدن عطا کرکے ایک پھٹے پرانے بستر پر ڈال دیا تھا جو یاس اور ناامیدی کی مکمل تصویر بنی اپنی ماں کی آخری سانسیں گن رہی تھی —— یہ سترہ اٹھارہ سالہ حسین اور صحتمند مریم کی کہانی ہے جو جھلملاتے ہوئے چراغ کے نیچے بیٹھی تھی جس کے چہرہ پر معصومیت اور تقدس کے علاوہ جوانی کا اُبھار تھا اور اعضا متناسب لیکن یہ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کے اوکار اس کے گرد جمع ہیں —— یہ گدھ جیسی آنکھوں والے منور کی کہانی ہے جو مریم کے سامنے اس کا آخری فیصلہ سننے کے لئے بیٹھا تھا جو اپنے آقا رحمن میاں کا سچا نمک خوار تھا۔ اور جس کو ۲۵ روپے تنخواہ اس کی ملتی تھی کہ وہ ان کے لئے ہر رات ایک نئی چھوکری فراہم کرے اور موقع ملنے پر ان کی چھوڑی ہوئی پلیٹ میں سے خود بھی کچھ چکھ لے —— یہ بڑھیا کے بیٹے رحیم کی کہانی ہے جو بڑھیا اور تینوں بچیوں کا آخری سہارا تھا۔ جو ایک مہینہ سے لاپتہ تھا اور جس کی تلاش میں پولیس متعدد مرتبہ اس چھوٹے سے کوارٹر کو اپنے قدموں سے زینت بخش چکی تھی —— یہ رحمن میاں کی کہانی ہے جن کی جیب میں پیسہ تھا اور رگوں میں جوانی کا خون اور غرور کا نشہ —— یہ اس وقت کی کہانی ہے جب مریم کے شگفتہ گالوں پر آنسو کے موتی بہہ رہے تھے۔ کوارٹر میں بوڑھی کی سسکیاں سنائی دے رہی تھی —— یہ اس وقت کی کہانی ہے، جب منور مریم سے کہہ رہا تھا ——

منوّر:- مریم! میرا کہا مان لے۔ میں تیری بھلائی کو کہہ رہا ہوں۔ پاگل نہ بن۔ میں تیری برائی نہیں چاہتا۔

مریم:- چچا! اگتا ہوں کا بوجھ جھولی میں ڈالکر بتلانا چاہتے ہو کہ یہ جواہرات ہیں —— (روکر) نہیں، نہیں —— مجھے ایسے جواہرات نہیں چاہئے۔

منوّر:- تجھ جیسی ہر ناسمجھ لڑکی پہلی مرتبہ لذت کو گناہ کہتی ہے —— اور پھر پگلی اس سودے میں عورت نہیں مرد بیوقوف ہوتا ہے!

زینت:- چچا! —— اگر تمھارے کوئی لڑکی ہوتی تو کیا تم اس کی اسی طرح سودا کرتے —— ماں چند گھنٹوں کی مہمان ہے۔ اگر وہ سن لیتی تو تمھاری ان موٹی موٹی مونچھوں کو نوچ کر پھینک دیتی۔

منوّر:- (اس پر دھیان نہ دیکر) ہاں، تو مریم! تیرا آخری فیصلہ کیا ہے؟ —— اب میں زیادہ نہیں بولوں گا —— (مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر) بہت سمجھا چکا بس —— اتنا اور سن لے کہ یہ سودا مہنگا نہیں ہے —— عمر بھر راج کریگی۔

مریم:- بس بس کہہ چکی تم جاؤ۔ (رونے لگتی ہے) آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو شرم نہیں آتی تم کو۔ (ہچکیوں کی آواز اور تیز ہو جاتی ہے۔)

منوّر:- (کھڑے ہوکر) بس تو میں جا رہا ہوں۔ لیکن یاد رکھ مریم کہ

تیرے غرور کا سر ضرور جھکیگا۔

(منور مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ مریم دوڑ کر اپنی قریب المرگ ماں سے لپٹ جاتی ہے اور ہچکیوں سے رونے لگتی ہے، پھر ایک دم جذبات اور خوف سے مغلوب ہو کر)

مریم :- ماں! - ابھی نہ مرو ماں - ماں - ماں — میری ماں (برابر روتی رہتی ہے) -

طاہرہ :- (مریم سے جھوک کر) مریم آپا روتی کیوں ہو - اماں تو کہتی تھیں وہ ابھی نہیں مرینگی - ابھی انھیں تمھاری شادی کرنا ہے - بھیا کی بہو لانا ہے - تم روتی کیوں ہو مریم آپا وہ ابھی نہیں مرینگی -

(مریم طاہرہ کو چمٹا کر اسے پیار کرتی ہے اور اپنے آنسو پونچھتی ہے اور طاہرہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے)

مریم :- نہیں میری ننھی — وہ ابھی نہیں مرینگی -

زینت :- (دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر) اے خدا تو بڑا رحیم و کریم ہے غریبوں کی امید کا آخری سہارا ہے - ہماری حالت پر رحم کر - اپنے حبیب پاک کے صدقہ میں اپنی خدائی کے صدقہ میں — (زینت کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) اے خدا اگر تیری مشیت ایک جان ہی کی بھینٹ چاہتی ہے تو پھر ماں کے بدلے میں مجھے اٹھالے میں مفلوج اور اپاہج ہوں — دنیا کو میری ضرورت نہیں —

(ایک قہقہہ فضا میں گونجتا ہے اور سڑک پر سے ایک موٹر تیزی سے گذر جاتی ہے - اس قہقہہ سے کوارٹر کی فضا میں ایک ہلچل پیدا ہوجاتی ہے - مریم اور زینت اس بے وقت قہقہے سے کانپ جاتی ہیں اور کوارٹر میں ایک سکوت سا چھا جاتا ہے - اس سکوت میں بڑھیا کے کراہنے کی آواز پیدا ہوتی ہے - مریم اور طاہرہ اس کی جانب متوجہ ہوجاتی ہیں - بڑھیا کچھ دیر کراہنے کے بعد)

بڑھیا :- مریم بیٹی — پانی — (کراہتی ہے) - پیاس — پانی — بیٹی — مریم — پانی — (کراہتی ہے)

مریم :- (تیزی سے اٹھ کر) — لائی ماں — اب کیسی طبیعت ہے؟

بڑھیا :- (کراہتے ہوئے) - مریم بیٹی - جلدی — بڑی پیاس ہے — موت کی — پیاس —

مریم :- ایسا نہ کہو ماں — (ایک کونے میں رکھے ہوئے مٹی کے گھڑے میں سے پانی لاکر) — لو ماں —

بڑھیا :- جلدی لا بیٹی — یا خدا — (کراہتی ہے) — کتنی پیاس — حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں — یہ مجھے دکھائی کیوں نہیں دیتا — آسمان پر اندھیرا کیوں ہے — اے خدا —

مریم :- (اس کے گلے میں ہاتھ ڈالکر اٹھاتے ہوئے) — لو ماں پانی پی لو — (سہارا دیکر اٹھاتی ہے) — لو ماں پانی — اب طبیعت کیسی ہے —

(بڑھیا گھبرا گھبرا کر پانی کا پیالہ ختم کرتی ہے اور پھر ہونٹوں کو چاٹتی ہے اور بستر پر لیٹ جاتی ہے -)

بڑھیا :- (کراہتے ہوئے) - رحیم کہاں گیا - ابھی تو یہیں کھڑا تھا — دیکھو تو شریر پھر چلا گیا — مگر — میرے لئے وہ دل میں کیسا درد ٹھو رہا ہے — دوا لینے گیا ہے — وہ ابھی ضرور آئیگا — اوہ — اوہ — (نڈھال ہو کر گردن ایک طرف ڈالدیتی ہے) -

مریم :- (گھبرا کر اس کے دونوں بازو پکڑ کر) ماں — ماں — تم بولتی کیوں نہیں ماں — (روتے ہوئے اسے جھنجھوڑتی ہے) ماں — ماں — یہ دیکھو ننھی طاہرہ تمھارے پاس بیٹھی ہے - اس سے تو دو چار باتیں کر لو ماں — (بڑھیا آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر) -

بڑھیا :- مریم بیٹی — طاہرہ کہاں ہے؟ -

مریم :- (طاہرہ کو گود میں اٹھا کر بڑھیا پر جھکاتے ہوئے) یہ ہے ماں — دیکھو تمھارے پاس ہے — اسے پیار تو کر لو — دیکھو ماں یہ رو رہی ہے —

(بڑھیا دونوں ہاتھ بڑھا کر اس کے گالوں کو چھوتی ہے اور پھر اپنا سر اوپر اٹھانے کی کوشش کرتی ہے - مریم طاہرہ کو اس کے پاس کر دیتی ہے - بڑھیا طاہرہ کو پیار کرتی ہے - طاہرہ روتے ہوئے)

طاہرہ :- ماں! ماں!! مرنا نہیں ماں!!! ابھی تو تمھیں بھیا کی بہو لانا ہے — ماں ابھی تمھیں مریم آپا کی شادی بھی تو کرنا ہے -

(بڑھیا کے چہرہ پر مسکراہٹ آتی ہے - پھر نحیف اور کمزور آواز میں) .

بڑھیا:۔ ہاں ابھی نہیں مروں گی بیٹی ـــ مجھے ـــ مجھے ـــ تیرے بھیا کی ـــ بہو لانا ہے ـــ مریم ـــ کی شادی کرنا ہے۔ زینت کہاں ہے بیٹی۔

زینت:۔ تیرے ہی پاس ہوں ـــ اے خدا ہماری ماں پر رحم کر۔

بڑھیا:۔ رحیم نہیں آیا۔ وہ ضرور آئیگا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے۔ مگر جانے وہ ہے کہاں۔ مریم بیٹی تو طاہرہ اور زینت کا ـــ خیال رکھنا۔ (ایک زوردار ہچکی آتی ہے) ـــ دیکھو۔ دیکھو ـــ وہ رحیم آرہا ہے ـــ وہ گھبرایا ہوا کیوں ہے ـــ وہ میرے لئے ضرور دوا ـــ میرے لئے پانی ـــ اوہ میرے خدا ـــ

(ایک زوردار ہچکی آتی ہے۔ آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ سر ایک جانب ڈھلک جاتا ہے۔ مریم گھبرا کر طاہرہ کو زمین پر بٹھا دیتی ہے اور بڑھیا کی نبض دیکھتی ہے۔ پھر ایک دم چیخ کر)

مریم:۔ ماں۔ ماں ـــ (رونے لگتی ہے) تم ہمیں تنہا چھوڑ کر چلی گئیں ماں ـــ ماں ـــ ماں ـــ

زینت:۔ مریم ـــ کیا ہوا مریم کہو تو ـــ ماں کو کیا ہوا مریم بولو نا، تم رو کیوں رہی ہو ـــ

(زینت بھی رونے لگتی ہے۔ طاہرہ بھی چلا کر روتی ہے اور ماں سے جھوم جاتی ہے۔ رو رو کر کہتی ہے)

طاہرہ:۔ ماں۔ تم تو کہتی تھیں کہ تمھیں مریم آپا کی شادی کرنا ہے تم ابھی نہیں مرو گی۔ تمھیں بھیا کی بہو لانا ہے۔ ماں۔ ماں۔

(ـــ ماں کی لاش سے چمٹ جاتی ہے۔ مریم اسے علیحدہ کرتی ہے۔ اپنے آنسو پونچھتی جاتی ہے اور ایک پھٹا ہوا لحاف ماں کی لاش پر ڈالدیتی ہے اور پھر ایک دم چیخ چیخ کر رونے لگتی ہے۔ ہوا اور تیز چلنے لگتی ہے اور کھڑکی کے پاس لگا ہوا بجلی کا بلب سڑک پر گل ہو جاتا ہے اور اس کی روشنی کوارٹر میں آنا بند ہو جاتی ہے، جس سے کوارٹر میں تاریکی بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ کوارٹر میں جلتا ہوا دیا برابر جھلملاتا رہتا ہے۔ کچھ دیر تینوں بہنیں سسکیوں سے روتی رہتی ہیں)۔

زینت:۔ رحیم بھیا ایک مہینہ سے نہیں آئے ـــ اب کیا ہوگا مریم ـــ

(مریم کچھ جواب نہیں دیتی برابر روتی رہتی ہے) ـــ اب کیا ہوگا مریم ـــ ماں مر گئی ـــ اب ـــ اب کیا ہوگا ـــ (سسکیوں سے روتی ہے، پھر اپنے آنسو پونچھکر) اس وقت کوئی اتنا بھی تو نہیں کہ شریف کو خبر کر دے۔ اسے تم سے محبت ہے نا مریم ـــ وہ ضرور ہماری امداد کریگا ـــ)

مریم:۔ ہاں ـــ وہ ضرور امداد کریگا ـــ مگر اس تاریک رات میں اسے خبر کیسے ہو ـــ کیا میں جاؤں وہاں ـــ

زینت:۔ نہیں نہیں ـــ جانے منور نے کیا منصوبہ باندھا ہے تم نہ جاؤ مریم ـــ

طاہرہ:۔ میں جاؤں زینت آپا ـــ مجھے تو ڈر نہیں لگتا ـــ

مریم:۔ (طاہرہ کو گود میں بٹھا کر پیار کرتے ہوئے) نہیں میری ننھی بہن۔

(ایک دم کواڑ کھٹکتا ہے اور رحیم گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے اور ادھر اُدھر چھپنے کی کوشش کرتا ہے)

طاہرہ:۔ (طاہرہ آنسو پونچھکر اس کے پاس دوڑ کر جاتے ہوئے) رحیم بھیا آگئے۔

رحیم:۔ ہشت! خاموش رہ!!۔

طاہرہ:۔ بھیا ـــ

رحیم:۔ ہشت ـــ خاموش رہ ـــ (چھپنے کی کوشش کرتا ہے)

مریم:۔ مگر بھیا ـــ ماں ـــ

رحیم:۔ مرنے دے ماں کو دیکھ کوئی دروازہ پر تو نہیں ہے۔

مریم:۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) ماں مر ہی گئی بھیا ـــ

رحیم:۔ (ایکدم خود کو بھول کر) ماں مر گئی ـــ کہاں ہے ماں کیا سچ مچ مر گئی ـــ (دوڑ کر اس کے پلنگ کے پاس جا کر) ماں کیا تم مر گئیں ـــ کیا سچ مچ مر گئیں ماں ـــ (بڑھیا کی لاش سے لپٹ کر رونے لگتا ہے) ماں میں تو تمھیں سے ملنے آیا تھا ـــ ماں۔ ماں۔ پیاری ماں ـــ بولو نا ـــ تم خاموش کیوں ہو ماں ـــ

زینت:۔ رحیم بھیا ـــ (رو کر) وہ تمھارے لئے بہو لانے گئی ہیں۔ کتنی خواہش تھی انھیں تمھاری بہو لانے کی ـــ آخری وقت تک وہ تمھیں ہی یاد کرتی رہیں ـــ

(سسکیاں بھر کر) مگر تم نہیں آئے ——— ننھی (نور) آنکھیں آنسو بہاتی رہیں، جو مہینہ بھر سے تمہیں دیکھنے کے لئے دروازہ پر لگی رہتی تھیں۔ مگر تم نہیں آئے بھیا۔

طاہرہ:۔ (سسکیاں بھرتے ہوئے) اب کیا ہوگا بھیا ——— ماں مرگئی بھیا ——— اب ———

رحیم:۔ (ننھی طاہرہ کو چمٹا کر) میری ننھی بہن روتی کیوں ہے میں تو موجود ہوں ——— تیرا بھائی ——— تیرا باپ ——— تیری ماں ——— تیری ماں کہاں مری ہے ——— میری تو رحیم کی ماں ہے ——— میری بچی ——— میری بہن) ———

طاہرہ:۔ ماں کہتی تھیں کہ وہ تیری بہو لائیں گی ——— مریم آپا کی شادی کرینگی ———

رحیم:۔ میں کروں گا مریم کی شادی ——— ماں تم نے میرا راستہ کبھی نہ دیکھا۔ (اپنے آنسو پونچھکر) ——— دیکھو میں آگیا ماں ——— دیکھو نا ———

مریم:۔ (جو کسی گہری سوچ میں مبتلا ہے) اب کیا ہوگا بھیا۔

رحیم:۔ سب کچھ ہو جائیگا مریم! ——— تو فکر کیوں کرتی ہے؟ اب تو میں آگیا ہوں۔

مریم:۔ (اسی طرح سوچتے ہوئے) لیکن بھیا! ——— دو روز سے گھر میں کھانے کا کوئی انتظام نہیں ——— (طاہرہ کو گود میں لیکر پیار کرتے ہوئے) طاہرہ بھوک سے تڑپتی رہی ہے جس ماں نے ——— اپنی زندگی ہمیں پرورش کرنے میں صرف کردی کیا اس کے لئے ہمیں کفن بھی نصیب نہ ہوگا۔

رحیم:۔ (اٹھ کر عزم کے ساتھ ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو گھورتے ہوئے) ماں کو کفن ضرور ملیگا۔ یہ محبت کرنے والی لاش بے کفنی نہیں رہ سکتی۔

مریم:۔ لیکن بھیا ——— (آنسو پونچھکر) ہم بھیک تو نہیں مانگ سکتے ——— اور پھر بھیک دینے والے بھی تو بھیک معاوضہ کی امید میں دیتے ہیں۔

رحیم:۔ بھیک! ——— کفن کے لئے بھیک ——— (پرعزم لہجہ میں) نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا ——— وہ ہاتھ بھیک کے لئے نہیں بڑھ سکتے جو دنیا کی دولت کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔

کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے کچھ دیر خاموشی رہتی ہے

(پھر رحیم ایک دم جوش میں آکر) نہیں نہیں۔ میری ماں کی لاش بے کفن نہیں رہ سکتی۔ میں اپنے حق کا نوالہ حلق میں سے چھین سکتا ہوں میرے بازوؤں میں قوت ہے۔ (ایک دم دروازہ کھلتا ہے اور قہقہہ کمرہ کی نیم تاریک فضا میں گونج اٹھتا ہے۔ سب کی نظریں دروازہ پر اٹھتی ہیں۔ ایک پولیس سب انسپکٹر اور دو کانسٹبل جن میں ایک شریف مریم کا عاشق بھی ہے کھڑے ہیں)

سب انسپکٹر:۔ تمہارے بازوؤں کی قوت سلب کرلی جائیگی بس اپنی جگہ پر کھڑے رہنا ورنہ ——— (کمر میں ڈٹے ہوئے ریوالور پر ہاتھ رکھتا ہے)

رحیم:۔ (اپنی جگہ پر ساکت کھڑا رہتا ہے پھر آہستہ سے) تم۔

سب انسپکٹر:۔ ہاں ——— (قہقہہ لگاکر) بہت دن تک پولیس کو دھوکہ دیتے رہے ہو ——— لیکن ہمارے چنگل سے بچ کر نہ جاسکے ——— (طنزیہ قہقہہ لگاتا ہے)

مریم:۔ (طاہرہ کو کھڑی کرکے) خدا کے لئے رحم کیجئے ——— اب ہماری امیدوں کا آخری سہارا یہی ہیں۔

سب انسپکٹر:۔ (قہقہہ لگاکر) آخری سہارا ——— (مسکرا کر مریم کو دیکھتے ہوئے) تم سفارش کررہی ہو اس کی ——— (مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہے)

مریم:۔ خدا کے لئے رحم کیجئے ——— (روتی ہے)

سب انسپکٹر:۔ رحم ——— (قہقہہ لگاکر)

زینت:۔ (اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) خدا آپ کو اس کا اجر دیگا۔

سب انسپکٹر:۔ اجر ——— (قہقہہ لگاتا ہے)

مریم:۔ دیکھئے نا ——— ہماری ماں کی لاش گھر میں پڑی ہے ——— اگر رحیم بھیا نہ رہے تو یہیں سڑ جائیگی۔

سب انسپکٹر:۔ (تعجب سے) لاش!!!

مریم:۔ ہاں ——— لاش ——— یہ دیکھئے ——— (چارپائی کی طرف اشارہ کرتی ہے) ——— حضور خدا کے لئے رحم کیجئے ——— (شریف کے پاس جاکر) تمہیں بھی تو مجھ سے محبت ہے شریف ——— تمہیں کچھ کہو ——— کچھ کرو ——— (شریف خاموش رہتا ہے) ——— تم خاموش کیوں ہو شریف ——— میں ——— (شریف کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر) تم رو رہے ہو۔

یہ وقت رونے کا نہیں — خدا کے لئے کچھ کرو شریف۔

طاہرہ: — (سب انسپکٹر کے پاس جاکر اس کے پاؤں چھوتی ہوئی) حضور کریم بھیا کو نہ لے جائیے —— پھر مریم آپا کی شادی کون کریگا ——

سب انسپکٹر: — (طاہرہ کو گود میں اٹھاکر پیار سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) — بیٹی —— میں مجبور ہوں۔

طاہرہ: — شریف بھیا — تم ہی کچھ کرو — چھوڑ دو میرے بھیا کو —— (رونے لگتی ہے)

شریف: — ہمدردی — قانون نے کبھی نہیں سکھلائی — وہ تو صرف اپنے الفاظ کی پابندی کرتا ہے

(تینوں بہنیں رونے لگتی ہیں۔ رحیم بڑھ کر سب انسپکٹر کی گود سے طاہرہ کو لیتا ہے اور اسے پیار کرتا ہے۔ پھر مریم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

رحیم: — مریم صبر کرو — اور خدا پر بھروسہ — وہ بڑا کارساز ہے — طاہرہ، اور زینت کا خیال رکھنا — تمہارے دن ضرور اچھے آئیں گے ——

(پھر زینت کے پاس جاکر اسے چوم جاتا ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ زینت کے آنسو پونچھتا ہے۔ پھر اس سے علیحدہ ہوکر سب انسپکٹر کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) چلئے سب انسپکٹر صاحب میں تیار ہوں (اس کی نظر پھر ایک ماں کی لاش پر پڑتی ہے اور ایک دم اس سے چوم کر) ماں ! تم ہمیں تنہا چھوڑ کر چلی گئیں — اور اب تمہیں تنہا چھوڑ کر جارہا ہوں — خدا کے حضور میں عرض کر دینا کہ میں بے قصور ہوں اور حق پر — مگر مجبور اور بیکس —— (اٹھ کر سب انسپکٹر کی طرف دیکھتا ہے)

سب انسپکٹر: — رحیم مجھے افسوس ہے — مگر میں مجبور ہوں یہ میرا فرض ہے۔

رحیم: — آپ اپنا فرض ادا کیجئے —— قصور آپ کا نہیں قانون کا ہے۔

(آہستہ آہستہ چل کر دروازہ کے پاس جاتا ہے، پلٹ کر پورے کمرہ پر ایک نظر ڈالتا ہے اور آنسو پونچھتا ہوا نکل جاتا ہے۔ اس کے پیچھے سب انسپکٹر، شریف اور دوسرا سپاہی بھی نکل جاتے ہیں کمرہ میں ایک کہرام مچ جاتا ہے۔ کچھ منٹ تک برابر رونے کی آوازیں آتی رہتی ہیں اور پھر آوازیں آہستہ آہستہ سسکیوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ ننھی طاہرہ آہستہ آہستہ سسکیاں لیتے ہوئے فرش پر لیٹ جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد اس کی سسکیاں بند ہوجاتی ہیں اور وہ سوجاتی ہے۔ مریم زینت کے پاس جاکر بیٹھ جاتی ہے اور دونوں برابر سسکیوں سے روتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی زینت کے منھ سے ارشاد اور خدا کے الفاظ سنائی دیتے ہیں جیسے وہ خدا کے حضور میں کچھ دعا مانگ رہی ہو۔ کچھ دیر بعد)

زینت: — مریم ! —— (مریم اپنی پرنم آنکھیں اس کے چہرہ پر گاڑ دیتی ہے) — سن رہی ہو۔

مریم: — ہاں زینت آپا کہو —— (ٹھنڈی سانس بھرتی ہے۔)

زینت: — زندگی بھی کیا عجیب ہے — اس میں کیسے کیسے واقعات ہوئے ہیں جو بے مقصد ہوتے ہیں۔ مگر کہانی بنجاتی ہیں —— کیا طاہرہ سوگئی ؟۔

مریم: — ہاں زینت آپا سوگئی —— بعض وقت آپ بھی عجیب باتیں کرنے لگتی ہیں ——

زینت: — اب میں بستر پر پڑے پڑے اور کرتی بھی کیا ہوں یہی سوچا کرتی ہوں — آج کی باتیں تو —— کیا یہ ایک کہانی سے کم نہیں۔ مریم ! — بعض وقت تو میں سوچتی ہوں کہ دنیا آخر ختم کیوں نہیں ہوجاتی ہے جو ایک کے لئے ہے اور دوسرے کے لئے نہیں ——

(مریم کوئی جواب نہیں دیتی —— برابر کسی گہری خیال میں کھوئی رہتی ہے) خدا کی مرضی۔

مریم: — خدا کی مرضی — بعض وقت تو اس مرضی کے خلاف۔

زینت: — نہیں مریم — ناامید ہوکر خدا کے سہارے کو بھول جانا بہت بڑی بھول ہے —— اس کے سہارے تو ہم میٹھے خواب دیکھتے ہیں۔

مریم: — اور جن خوابوں کی کبھی عمدہ تعبیر نہیں ہوتی۔

زینت: — نہیں مریم ! — ناامید مت ہو — خدا ہمیشہ

ناامیدوں اور بے کسوں کو سہارا دیتا ہے ۔ اس کے یہاں دیر تو ہے مگر اندھیر نہیں ۔

مریم :۔ یہی دیر تو اب اندھیر بن گئی ہے ۔ جانے یہ اندھیرا کب تک رہیگا ۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) اب ماں کی لاش کا کیا ہوگا!؟۔

زینت :۔ جو خدا کو منظور ہوگا ۔

رحمٰن :۔ (داخل ہوتے ہوئے) خدا کو نہیں جو ہمیں منظور ہوگا ——— تو تمھاری ماں مرگئی ———

زینت :۔ ہاں رحمٰن میاں ——— ہم کو بے سہارا چھوڑ کر چل بسیں

رحمٰن :۔ اور تمھارے بھائی کو بھی پولیس نے گرفتار کر لیا ۔

زینت :۔ ہاں ! بے قصور !!۔

رحمٰن :۔ (مسکرا کر) بے قصور ہی سہی ۔ لیکن اب وہ تمھارے پاس نہیں ۔ (مریم کی طرف دیکھ کر) کہو مریم ۔ (مسکرا کر) اب کیا ارادہ ہے ۔

مریم :۔ جو خدا کو منظور ہو ۔

رحمٰن :۔ (قہقہہ لگا کر) جو خدا کو منظور ہو ——— ہنہ ——— یہ بھی ایک ہی رہی ۔ ابھی تو تم خدا کے خلاف بغاوت کر رہی تھیں اور اب خدا کی مرضی کے راگ الاپنے لگیں ۔ کس قدر بیوقوف ہوتے ہو تم لوگ ۔ میں اس وقت بھی تمھاری مدد کرنے کو تیار ہوں ۔ کہو تمھیں منظور ہے ۔

مریم :۔ رحمٰن میاں ——— وقت بے وقت ———

رحمٰن :۔ ارے چھوڑو وقت بے وقت کو ۔ کاروبار میں وقت بے وقت کیسا ۔ تم تو یہ کہو تیار ہو ۔

زینت :۔ خدا کے لئے رحمٰن میاں انسان بنئے ۔

رحمٰن :۔ (قہقہہ لگا کر) انسان ۔ تو تمھیں میرے انسان ہونے پر شک ہے ۔ میں انسانوں کی طرح رہتا ہوں ——— کھاتا ہوں ۔ پیتا ہوں ۔ اُٹھتا بیٹھتا ہوں ۔ پھر بھی تمھیں میرے انسان ہونے پر شک ہے ۔ (مسکرا کر) خیر یونہی، میں حیوان ہی سہی ۔ مگر ایک حیوان تمھاری مدد کرنا چاہتا ہے ۔ کہو مریم منظور ہے ۔

مریم :۔ (آنسو پونچھ کر) نہ مجھے نہیں چاہئے ایسی مدد ۔

رحمٰن :۔ تمھاری مرضی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں اپنی ماں سے کوئی محبت نہیں ۔ دیکھو مریم یہ لاش یونہی بے کفن پڑی پڑی سڑ جائیگی اور کوئی ہاتھ بھی نہ لگائیگا ——— سمجھیں تم ۔ بلا وجہ کیوں اپنی ماں کی مٹی خراب کرتی ہو ۔

مریم :۔ لیکن ———

رحمٰن :۔ لیکن ——— اور مگر نے ہمیشہ دنیا کو مصیبتوں میں مبتلا رکھا ہے ۔ یہ پس و پیش تباہ ہونیکا پیش خیمہ ہے سمجھ لو اس کو ۔ میرے پاس دولت ہے، عزت ہے ۔ میں تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں ۔

زینت :۔ ایسی مدد نہیں چاہئے ۔ ہمیں خدا اور رسول کو منھ دکھانا ہے ۔

رحمٰن :۔ تم دکھانے اور چھپانے میں ابھی رہو ۔ مریم جو وقت سے فائدہ نہیں اُٹھاتا وہ احمق ہے ۔ اگر تم وقت سے فائدہ اُٹھانا نہیں چاہتیں تو نہ چاہو ۔ مگر یاد رکھو یہ لاش یہیں کیڑے مکوڑوں کی خوراک بن جائیگی اور کوئی نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گا ۔ مریم کفن دینے والا تو کجا مٹی دینے والا بھی نصیب نہ ہوگا ۔ ابھی وقت ہے سوچ لو ۔

مریم :۔ (اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر) خدا کے لئے چپ رہئے ۔

رحمٰن :۔ مریم ! میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو لوگوں کو مجبور دیکھ کر وقت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں ۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے اور اسی لئے میں تمھاری ——— مدد کرنا چاہتا ہوں ۔ بھلا سوچو تو اس ضد سے کیا فائدہ ہے ۔ بہرحال تم اپنی زندگی میں کسی نہ کسی کی تو ہو کر رہوگی ہی ۔ پھر مجھ میں کیا خرابی ہے ۔

مریم :۔ لیکن ———

رحمٰن :۔ لیکن ویکن کچھ نہیں ۔ میرے پاس عزت ہے، دولت ہے ۔ میں تمھاری ماں کے لئے کفن فراہم کر سکتا ہوں ۔ اس کی مٹی کا انتظام کر سکتا ہوں ۔ تم سب بہنوں کی زندگی خوشگوار بنا سکتا ہوں ۔

مریم :۔ لیکن یہ گناہ ہے رحمٰن میاں !۔

رحمٰن :۔ گندہ۔ دنیا میں گناہ کا وجود صرف اس قدر ہے کہ ہم اس سے ڈرتے ہیں۔ ڈر کا نام گناہ ہے۔ خود میں ذرا سی جرأت پیدا کرو پھر دیکھو گناہ میں کس قدر لذت ہے۔ مریم بیوقوفی کا تو دنیا میں کوئی علاج نہیں۔ (مریم کے پاس جا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر) آؤ میرے ساتھ چلو۔ خوف کو دل میں جگہ نہ دو۔ یہ لذت سے انحراف ہے۔

مریم :۔ (اپنا ہاتھ چھڑا کر) نہیں، نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی ماں کا کفن اس طرح نہیں خرید سکتی۔

رحمٰن :۔ ضد نہیں مریم۔ دنیا اسی طرح چلتی ہے۔ بلا معاوضہ کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا۔ اٹھو۔ (ہاتھ پکڑتا ہے اور مریم کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو جاتی ہے) سوچو نہیں صرف گمراہ ہو جاؤ گی۔ کیا تمہیں اچھا معلوم ہوگا کہ تمہاری ماں کی لاش۔ اس ماں کی لاش جس نے تمہارے لئے ہزاروں تکالیف برداشت کیں اس طرح بے گور و کفن پڑی رہے۔ اٹھو! ۔ چلو!!۔

مریم :۔ (ہاتھ کھینچ کر) نہیں۔ ذرا مجھے سوچنے دیجئے۔

رحمٰن :۔ (ہاتھ چھوڑ کر) بس تو سوچتی رہو۔ ایک دن، دو دن، چار دن، چار مہینے۔ یہاں تک یہ لاش یہیں سڑ جائے بدبو پھیلے۔ کیڑے کوڑے ——

مریم :۔ خدا کے لئے رحمٰن میاں ایسا نہ کہئے ——

رحمٰن :۔ یہ تو نتیجہ ہونے ہی کو ہے۔ آؤ! اب بھی میرا کہا مانو میں بار بار تم سے نہیں کہہ سکتا۔ آؤ، اس میں حرج ہی کیا ہے۔ (پھر ہاتھ پکڑتا ہے اور مریم اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے)۔

زینت :۔ (مریم کو کھڑے ہوئے دیکھ کر) مریم کیا کرتی ہو۔ سوچو! میری بہن یہ سب دھوکہ ہے۔ فریب ہے۔

رحمٰن :۔ (مسکرا کر) زینت بیچاری نے تو اسے بزدل بنا دیا ہے۔ مریم آؤ! (آگے بڑھتا ہے۔)

زینت :۔ مریم۔ مریم کیا کرتی ہو۔ (اٹھنے کی کوشش کرتی ہے اور مریم دروازہ کی جانب بڑھتی ہے زینت چلا کر) رحمٰن میاں خدا کے لئے اسے فریب نہ دو۔ وہ ابھی بچی ہے رحمٰن میاں۔ اگر تم نے کفن کی قیمت کسی کی عصمت ہی مقرر کی ہے تو پھر میں حاضر ہوں۔ دنیا کو میری ضرورت نہیں۔ وہ ہمارا آخری سہارا ہے۔

رحمٰن :۔ (طنزیہ مسکرا کر) تم حاضر ہو۔ (قہقہہ لگاتا ہے) جب دنیا کو تمہاری ضرورت نہیں تو مجھے کیا ضرورت ہوگی۔

زینت :۔ مریم! خدا کے لئے نہ جاؤ۔ نہ جاؤ مریم۔ دیکھو! (شریف داخل ہوتا ہے) شریف خدا کے لئے اسے روکو وہ جا رہی ہے اپنی زندگی تباہ کرنے۔ اپنی عصمت سے اپنی ماں کا کفن خریدنے۔ روکو اسے شریف، روکو۔

(شریف مبہوت کھڑا رہتا ہے اور مریم برابر آگے بڑھتی رہتی ہے۔ اس کے چہرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے اور نہ سمجھ رہی ہے۔ نہ سن رہی ہے۔ مریم اور رحمٰن دروازہ کے پاس پہونچ جاتے ہیں۔ رحمٰن کی بہن شمیمہ داخل ہوتی ہے اور غصہ سے رحمٰن کا ہاتھ پکڑ کر)

شمیمہ :۔ رحمٰن بھیا! میں نے ہزار مرتبہ کہا مگر آپ نے کبھی اس پر دھیان نہیں دیا۔ کہ آپ کا خادم خاص ——

رحمٰن :۔ کیا ہوا شمیمہ ——

شمیمہ :۔ اب ہونے کو رہ ہی کیا گیا تھا۔ اگر میں بھاگ نہ آتی —— وہ شراب کے نشہ میں میرے کمرہ میں۔

رحمٰن :۔ (مریم کا ہاتھ چھوڑ کر)۔ اس کمینہ کی یہ مجال۔

شمیمہ :۔ سر پر چڑھا لیا ہے آپ نے۔ اب وہ یہ نہیں کریگا تو اور کیا کریگا۔

رحمٰن :۔ لیکن اس کی یہ جرأت کیسے ہوئی۔

شمیمہ :۔ کمینوں کو جب سر پر چڑھایا جائیگا تو یہی حشر ہوگا۔ —— ان کی یہ جرأت نہ ہوگی —— جس ہنڈیا میں کھائیں اس میں چھید نہ کریں تو ——

رحمٰن :۔ میں اس کمینہ کو گولی مار دوں گا —— (دروازہ کی جانب بھاگتا ہے) ——

زینت :۔ اپنی عزت اس قدر عزیز ہے —— اور ہماری۔ (شمیمہ بھی دروازہ سے نکل جاتی ہے۔ شریف سے مخاطب ہو کر) کس قدر خوفناک ہوتے ہیں یہ لوگ۔ مریم! مریم!! (مریم خاموش رہتی ہے)۔ تم بولتی کیوں نہیں ——

مریم بے قصور ہے شریف ——— اس کو دھوکہ دیا گیا تھا ——— مریم تم بولتی کیوں نہیں ——— شریف اسے سمجھاؤ ———

شریف:۔ میں تمہاری مدد کرنے آیا تھا ——— صرف مریم کی محبت کی خاطر ——— لیکن جو مصیبتوں سے گھبرا کر خود کو اس قدر گرا لے میں اس کے قابل نہیں۔ (جیب میں سے کچھ روپیہ نکال کر مریم پر پھینک کر)۔ یہ لو اس سے کفن خرید لینا تم اب بھی رحمٰن میاں کے پاس جا سکتی ہو ———
(غصہ سے دروازہ سے نکل جاتا ہے)۔

زینت:۔ (چیخ کر) شریف! شریف!! ۔ ٹھہرو! کہاں چلے مریم روکو نا اسے دیکھ روک (بستر سے اٹھنے کی کوشش کرتی ہے مگر گر پڑتی ہے۔ اس چیخ پکار میں طاہرہ کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے)۔ مریم! مریم!!۔

مریم:۔ (ایک خوفناک قہقہہ لگا کر) ہا ہا ہا ۔ رحمٰن میاں ہا ہا ہا ۔ میں جا رہی ہوں رحمٰن میاں کے پاس۔ ہا ہا ہا۔ (بے تحاشہ پاگلوں کی طرح بھاگتی ہے اور دور تک اس کے قہقہے سنائی دیتے ہیں)۔

زینت:۔ مریم! مریم!! سنو ——— (خاموش ہو جاتی ہے طاہرہ کو دیکھ کر، جو روپے اٹھانے میں مشغول ہے۔)
طاہرہ ———

طاہرہ:۔ یہ روپے ——— (سمیٹتی رہتی ہے)۔

زینت:۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر)۔ ہاں ——— ماں کے کفن کے ہیں۔

(پردہ)

——— (بقیہ "بھاگسوناتھ") ———

اور پاکستان پہنچ کر میرا پہلا نعرہ یہ تھا۔ اے ذرم سالہ، اے دیوتاؤں کی سرزمین، تو غمگین نہ ہو، میں ضرور آؤنگا، ہم سب ضرور آئیں گے، اور تیری پیشانی سے یہ کلنگ کا ٹیکہ دھوئیں گے، اور اے دلاری، تو مسرور رہ اور اُس دن کی امید کر جب میں تیرے پاس مسرور آؤنگا۔ تو خود بلائے گی، جب تو گھبرائے گی، تو میں فوراً دوڑا آؤنگا ——— ہر اور مجھے محسوس ہوتا ہے۔ جیسے واقعی بھاگسوناتھ کا پانی، کانگڑے اور نورپور کا قلعہ اور جوالا مکھی کا کلس مجھے بلا رہا ہے۔ اور میں اُس دن کے انتظار میں مسرور رہتا ہوں۔ جب میں وہاں داخل ہونگا ——— جب انسانیت کی فتح ہوگی۔ اور حیوانیت کو ایک بار پھر سب مل جل کر کسی گہرے اور تاریک کھڈ میں دفن کر دیں گے۔ جہاں سے وہ دوبارہ سر نہ ابھار سکے ——— !!!

جبؑ وہ آزاد ہوئے تو ——— !

• اُن کی آنکھوں میں آنسو کیوں تھے ——— ؟
• اُن کی ہنسی میں زہر کیوں بھر گیا تھا!
• وہ گونگے کیوں ہو گئے تھے ——— ؟
• وہ بھوکے ننگے اور بے گھر کیوں ہو گئے تھے ؟
• وہ ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گئے تھے ——— لیکن

؟ ؟ ؟ ؟ ؟

عوام کا محبوب فنکار فکر تونسوی اُن کے ساتھ رہا۔ کر اُن کی کہانیاں سنتا رہا اُن کی آگ میں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھتا رہا
اور پھر ایک کتاب لکھی!

دھواں اٹھتا ہے

فکر تونسوی کے دس طنزیہ اور زہریلے مضامین کا مجموعہ جلد چھپ رہا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

ادبی منڈی، پبلشرز • دہلی (عبدالرحمٰن روڈ ـ قرول باغ)

فسادی ادب

ہندوستانی فنون لطیفہ پر ایک نظر

جائزے

ادب زندگی کی تخلیق کرتا ہے اور زندگی ادب کی خالق ہے:

انتصار نیوتنوی

فسادی ادب

آج کل ادب میں ایک عجیب و غریب عنصر بہت تیزی سے کارفرما ہے جس کا کوئی نام مشکل ہی سے دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اسے "قسم کا ادب" جو غالباً ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد کی پیداوار ہے اور جس سے متاثر ہو کر ہمارے ادیبوں نے کہانیاں اور نظمیں لکھی ہیں۔ اس سیاسی انقلاب کے بعد ادب کی جو شاہراہ مقرر کی گئی ہے اس کے لئے یہ کوئی نیک شگون نہیں ہے۔ اور اس قسم کی تمام چیزیں پڑھنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ ارادتاً ہمارے ادیب سیاسی پروپیگنڈہ کے شکار ہو گئے ہیں۔ قتل و خون اور غارتگری جو کچھ بھی ملک میں ہوا اس سے متاثر ہونا۔ انسان کا فرض تھا۔ کیونکہ یہ ایک ایسا انقلاب تھا جس کے تباہی کے بھنور میں ایک بہت بڑی انسانی دنیا سما گئی۔ باہر کی دنیا نے جو کچھ محسوس کیا اور دیکھا وہ اس بڑے انقلاب کی صحیح تشریح کرنے سے قاصر ہیں۔ اور وہ مصیبت زدہ لوگ جو کچھ لکھنے اور کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس عذاب میں مبتلا ہوئے خاموش ہیں۔ البتہ کسی ایک ادیب نے جو براہ راست اس مصیبت کا شکار ہوا اور سامنے جو کچھ لکھا وہ "ادبی" حیثیت سے ادب میں ہمیشہ زندہ رہیگا۔ مثال کے طور پر اس وقت صرف شاہد احمد دہلوی کا ایک مضمون "دہلی" اس حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ شاہد احمد کے اس مضمون میں ایک پرانا تمدن دلی کی تمام روایتی خوبیاں ان کے قلم سے رخصت ہو رہی ہیں اور ان کا دماغ و دل اس ہنگامہ کا بغور مطالعہ کر رہا ہے۔ اس مضمون سے قبل کرشن چندر کی کہانیاں "ہم وحشی ہیں" ہندوستان کے بازاروں میں خوب خوب فروخت ہوئیں اور ابتک اس کتاب کے نئے ایڈیشن نکل رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں کسی اچھی کتاب کی تنہا دلالت اس کی قیمت نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس کتاب کے متعلق جو کچھ اہل بصیرت نے کہا وہ نہ ہمت افزا ہے اور نہ قابل ستائش مگر کتاب کا عوام میں خوب چرچا ہے۔ اس کی مقبولیت کے اسباب ویسے جو کچھ بھی ہوں مگر عام طور پر ایک اوسط درجہ کا پڑھا لکھا انسان اس لئے پسند کرتا ہے کہ اس کے سوچنے اور سمجھنے کا دائرہ اتنا ہی محدود ہے جتنا کہ کرشن چندر نے اپنا نقطۂ نظر اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ تمام باتیں اس قدر سطحی اور صاف ہیں کہ وہ ایک سرکاری ادارے کا کامیاب پروپیگنڈہ بن گئی ہیں، حالانکہ کتاب اس مقصد سے لکھی نہیں گئی ہے۔ طوائف کے خط میں بیلا اور بتول کی تفسیر حیات ایک منطقی تماشہ ہے۔ ان دو بچیوں سے کرشن چندر نے ایک مداری کی طرح کام لیا ہے۔ ملک کے دو بڑے لیڈروں سے مخاطب ہو کر انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ایک بندر اور بندریا والے کے خیالات اور فن کی آئینہ داری کرتا ہے۔ ان کے دوسرے افسانے "پیشاور ایکسپریس"، "تین غنڈے" ان خامیوں سے کسی حد تک بچ گئے ہیں۔ مگر اس موضوع پر کامیاب افسانے کہلانے کے مستحق نہیں۔ ادب میں اس قسم کی وقتی ٹھونس ٹھانس کوئی زندہ جاوید کارنامہ نہیں ہے۔ ادب صحافت نگاری سے علیحدہ ایک چیز ہے۔ پھر فسادی ادب کا جو منشا ہے اور اس سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ انسانی نفسیات کے بالکل بعید ہے۔ پنجاب اور دلی میں جو کچھ ہوا اور جس کا ہمارے ادب میں اظہار کیا گیا وہ نفسیاتی درس کے خلاف ہے۔ اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں۔ اول تو جو سبق ہم نے انسانی نفسیات سے متعلق پڑھے ہیں وہ غلط ہیں اور یا پھر فسادات اس قدر وسیع اور شدید پیمانہ پر نہیں ہوئے جن کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ اس تبدیلی کا احساس اگر ہماری نفسیات پر کسی طرح پڑ سکتا اور ہم اپنی نفسیاتی کتابوں میں کچھ اصلاح کر سکتے تو یہ ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا مگر اس کے برعکس ادیب ایک غلط پروپگنڈہ میں مصروف ہو گئے جو نہ پبلک کے لئے مفید ہے اور نہ گورنمنٹ کے لئے۔ یہ ترقی پسندی اب انتہائی رجعت پسندانہ روش بن چکی ہے کہ ادھر گورنمنٹ کا نام آیا اور لوگوں نے گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ گورنمنٹ سے ہماری

بیزاری کی وجہ بہت پرانی ہے۔ ہم کچھ اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان بدلے ہوئے حالات میں بھی ہم ہندوستان اور پاکستان کی مملکتوں سے ناخوش ہیں۔ انھیں سرمایہ دار۔ رجعت پسند اور شہنشاہیت کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اس کہنے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ حکومتوں کا بالکل ہی جامعہ پہن لیا جائے بلکہ خیال کی وسعت اور گہرائی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ حالات بدل گئے تو اب بہت سے لوگوں کا رجحان یہ ہے کہ انگریز اچھے تھے۔ انگریز گئے تو ہندوستانی برے ہو گئے۔ اب کوئی تیسری قوم کہاں سے آئیگی؟ احمد علی نے ایک جگہ لکھا تھا کہ ادب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہیئے اور یہ حقیقتاً ایک بہت کام کی چیز انھوں نے ہمیں بتائی تھی۔ ادب، حالات، واقعات، اور انقلابات کا آئینہ دار بن سکتا ہے مگر سیاست کا نہیں اور ان تینوں چیزوں اور سیاست میں بڑا فرق ہے۔ سیاست وقتی عمر لیکر پیدا ہوئی ہے۔ حالات کی عمر طبعی ہے۔ اور وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی جگہ پیدا کر لیتا ہے اور اسی لئے ادب میں ہی اس کے لئے بیحد گنجائش تھی اور اب بھی ہے اور واضح طور پر سیاست اور حالات کا فرق اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر کتا آدمی کو کاٹ لے تو۔ یہ حالات کے مطابق ہے لیکن اگر کبھی آدمی کتے کو کاٹ لے تو یہ سیاست ہوگی ظاہر ہے کہ آدمی کا کتے کو کاٹنا عادتاً نہیں بلکہ ضرورتاً ہوگا۔ اور یہ چیز اپنی وقتی ہنگامہ خیزی کے ساتھ بہت جلد ختم ہو جائیگی۔ اور اس قسم کا کوئی جذبہ ادب میں تعمیری کام نہیں کر سکتا۔ ہم اس موجودہ فساد کو جس طرح وہ ادب کی راہ سے ہمارے سامنے آیا ہے ایک ایسی ہی لڑائی سمجھتے ہیں جس میں آدمیوں نے کتوں کو کاٹا ہے اور اس لئے یہ پروپگنڈہ ملک کے لئے ایک شرمندگی کا باعث بن گیا ہے۔

ادب میں اول تو اس موضوع کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے، اور اگر نقطۂ نظر صرف پروپگنڈہ ہو جس کے کوئی معنی و مطلب اب تک سمجھ میں نہیں آسکے ہیں تو اس سے متاثر کون ہوگا۔ ہندوستان کے عوام اگر آج اس نقطہ پر نہیں پہونچے ہیں تو کل پہونچینگے اور اس فسادی ادب میں جو چیزیں آج انھیں لبھا رہی ہیں کل اُنسے حقارت پیدا ہوگی۔ اگر یہ پروپگنڈہ انگریزوں کو پھر واپس بلانے کے لئے ایک آواز ہے تو وہ بھی اس لئے بیکار ہے کہ انگریز اب ان آوازوں سے واپس نہیں آئیگا۔ وہ ان آوازوں کو تقسیم سے قبل اپنے لاشعور میں سُن رہا تھا البتہ یہ اشارے اگر کسی اور ملک کے لئے ہوں اور ان میں کسی اور قوم کی آواز مضمر ہو تو کوئی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ پنجاب میں ادب کی ہر آنے والی اور موجودہ صنف کا چرچا ہوا اور ہوتا رہیگا۔ چنانچہ فسادی ادب نے بھی سب سے پہلے پنجاب کے رسالوں میں جنم لیا پھر رفتہ رفتہ ایسے ہاتھ پاؤں نکالے کہ دوسروں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگا۔ چنانچہ یہ چیز کسی قدر افسوس کے ساتھ سُنی گئی کہ پاکستان نے اپنے یہاں کے چند معیاری رسالوں کو بند کر دیا۔ جن میں "نقوش" اور "سویرا" کے نام خصوصیت کے ساتھ لئے جا سکتے ہیں۔ نقوش کا آزادی نمبر میری نظر سے گذرا ہے اور میں نے خصوصیت کے ساتھ اس نمبر کو اس نظر سے پڑھا ہے کہ سرکاری اعتراضات جو اس پر عائد ہوئے ہیں وہ کس حد تک درست ہوں گے مگر بحیثیت ایک ادیب کے مجھے یہ لکھتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ سرکاری نقطۂ نظر اس سلسلہ میں ٹھیک تھا۔ تمام مضامین پڑھنے کے بعد جو اثر دماغ پر ہوتا ہے وہ زیادہ خوش کُن نہیں ہے۔ وہی فسادی ادب کا پرچار۔ اس کی مختلف ٹیکنک۔ اس کے عجیب غریب اُتار چڑھاؤ۔ سبب مجھے بہت سے مضامین بغیر پڑھے ہوئے چھوڑنا پڑے۔ پطرس جنکا ہمارے ادب کو ایک مدت سے انتظار تھا ایک ایسا پوچ مضمون لکھ کر ادب کی سونی محفل میں عمر دراز کے بعد شریک ہوئے ہیں کہ سر پیٹنے کو دل چاہتا ہے۔ منٹو نے بغیر عنوان کا افسانہ لکھا ہے اور اس پر ایک عدد لاٹری ڈالدی ہے۔ یعنی جو صاحب عنوان منتخب کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ اُن کے نام "نقوش" ایک سال تک جاری کر دیا جائیگا۔ ڈاکٹر تاثیر نے بھی ایک ایسی کہانی لکھی ہے جو دس بارہ سطروں کے بعد ٹھپ ہو کر رہ گئی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ بھی فسادی ادب کی دین ہے۔ اور پاکستان کے مہاجروں کے لئے ایک بہت بڑی پست ہمتی کا ثبوت دیتا ہے۔ غرضکہ تمام رسالہ میں۔ کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کے پڑھنے سے نہ ملک و قوم میں کسی سدھار کی اُمید ہے نہ صحت افزائی کی بلکہ ادب کے ذریعہ ایک عجب حسرت ناک قسم کی افسردگی سارے ملک میں پھیلانا مقصود ہے۔ ان حالات کے تحت اگر گورنمنٹ ادب کے حفظان صحت کے مدنظر کوئی ایسا

قدم اُٹھالیتی ہے تو بربادی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ بنگال کا قحط عرصہ ہوا ملک میں اس قسم کی بدہضمی پیدا کرچکا ہے۔ اُس ادب سے ہی لوگ اُکتا کر چیخ اُٹھے تھے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس وقت کا ادبی شاہکار "ان داتا" آج کی دنیا میں کوئی وقعت نہیں رکھتا ہندوستان میں کسی سیاسی حالت کا اندازہ افسانوں یا نظموں سے نہیں لگایا جاسکتا اس کے لئے مضامین کی زمین زیادہ بہتر ہوسکتی ہے۔ افسانوں اور نظموں کے لئے ہمارے ملک میں جو روایت ہے وہ انتہائی مبہم اور خطرناک قسم کی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ افسانہ حقیقت کے خلاف ہوتا ہے اور یہ چیز بھی اس لئے سمجھ میں آتی ہے کہ یہاں جن افسانوں کو عروج ملا یا افسانے مغربی ادب سے براہ راست اردو میں منتقل ہوئے وہ حقیقت کی دنیا سے الگ اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ افسانوں میں حقیقت کا تقاضا شروع ہوا۔ اور اس سلسلہ میں بھی اچھے افسانے لکھے گئے۔ مگر اس وقت تک کوئی متعین زمین افسانوں کے لئے منتخب نہیں ہوسکی ہے۔ برخلاف اس کے ناول کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس کے لئے جھوٹ، جدت اور بناوٹ کی کوئی گنجائش نہیں اس کے لئے تمدن ہونا چاہیئے اور تمدن ہمیشہ کسی نہ کسی حقیقت پر مبنی ہوا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں افسانوں سے زیادہ ناولوں کو وقعت دی گئی، بازاروں میں ان کی مانگ بڑھی اور اب روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ ناول میں کسی سیاسی پروپگنڈہ کی بھی بہت کم گنجائش ہے۔ اور نہ اس میں وقتی چیزیں ٹھونسی جاسکتی ہیں۔ ناول نگاری افسانہ نگاری سے کہیں زیادہ مشکل فن ہے اس ملک میں عزیز احمد کو چھوڑ کر اور کوئی ناول نگار نظر نہیں آتا۔ البتہ کامیاب افسانہ نگاروں کے نام ہمت افزا ہیں اور پروفیسر احمد علی کا نام سب سے پہلے لیا جاسکتا ہے۔

ادب اور آرٹ میں زندگی کے وہ عناصر شامل ہوتے ہیں جنکا تعلق براہ راست "تکلیف" بھ.ک، اور غربت سے نہ ہو ہمارا ترقی پسند ادب انھیں تکالیف کی ترجمانی کرتا ہے۔ مگر احساس کی قوت کو جادوگری سمجھا جارہا ہے تو بتائیے کہ ترقی پسند ادیبوں میں کتنے بھوکے، غریب اور مصیبت زدہ ہیں۔ غالباً صف اوّل کے ادیبوں میں آپ کسی کا نام نہ لے سکیں گے۔ لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ جو ادب یہ پیش کررہے ہیں اس کا تعلق ان کی زندگی سے نہیں تخیّل سے ہے اور احساس کی شدت انھیں لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ فسادی ادب کا کچھ ایسا ہی کرشمہ ظہور پذیر ہوا۔ اس وقت فسادی ادب کا پرچار کرنے والوں میں ایک یا دو کو چھوڑ کر باقی تماشہ بینوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور وہ ادیب جو براہ راست اس مصیبت کا شکار ہوئے خاموش ہیں فساد کو جن ادیبوں نے دیکھا ہے اور جن میں احساس کی پوری شدت پیدا ہوئی ہے انھوں نے حقیقتاً بے نظیر ادب پیش کیا ہے۔ ہاجرہ مسرور کا افسانہ "ہم انسان بنے بیٹھے ہیں" ایک کامیاب مگر طنز بھری کوشش ہے جو کسی عقدہ کا حل نہیں پیش کرسکتی۔ ڈراموں کی طرح افسانے کسی کشمکش کا نام نہیں ہیں۔ زندگی کو بہرحال ایک آسودگی کی ضرورت ہے۔ خصوصاً جب زندگی کا ترجمان کوئی ایسا ادب ہو جو سیاسی کشمکش کا نتیجہ بن جائے۔ معصوم بچوں کا قتل، عورتوں کی عصمت دری۔ شریف عورتوں کا اغواء انتہا عبرت ناک چیزیں ہیں مگر ادیب جب ان پر روشنی ڈالیگا تو فراری پہلو اختیار نہیں کرسکتا۔ ان تمام تباہ کاریوں کے بعد اُسے ایک ایسی منزل کا پتہ دینا لازمی ہے جہاں افسردگی سے اُمید کی شمع جلتی ہو۔ انسان کو لعنت ملامت کے طوق پہنا کر نصیحت کرنا کوئی دانشمندانہ طریقہ نہیں ہے۔ اور نہ افسانہ کو لاوارث بنا کر پیش کرنا چاہیئے۔ دنیا کے ہر ملک کا انقلاب کچھ روز تک بہت خاموشی سے دیکھا اور سُنا گیا ہے پھر اس پر قلم بھی اُٹھایا گیا ہے۔ زار کی حکومت کے بعد روس میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ ردِ عمل کی صورت میں دنیا کے سامنے آئیں اور اس لئے وہ ادب آج بھی دنیا کی نظر میں ایک وسیع مقام رکھتا ہے مگر ہندوستان کے اس فسادی ادب کا کیا مقصد ہے کوئی نہیں بتلا سکتا۔ لکھنے والے کس پروگرام کے تحت کام کررہے ہیں؟ وہ اب ہندوستان کو کس شکل میں ڈھالنا چاہتے ہیں؟ یہ کسی کو نہیں معلوم۔ تمام افسانے اور نظمیں پڑھنے کے بعد صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ یہ ادب ایک فوری جذبہ کی پیداوار ہے جس کی عمر اس قدر ہے کہ کوئی دوسری سیاسی چال اس تبدیلی کی جگہ لے لے میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے تمام ذمہ دار ادیبوں نے اس حقیقت کا جائزہ لیا ہے۔ اور وہ خاموش ہیں۔ احمد علی کا کوئی افسانہ اس بارے

مرہونِ منت نہیں ہے۔ عزیز احمد اپنے ایک مضمون میں اس بلا کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے مخصوص طبقہ کی جس کی وہ ترجمان ہیں کوئی حالت نہیں بتلائی۔ بیدی اور منٹو بھی اس میدان میں کسی نمایاں شخصیت کے مالک نہیں نظر آتے۔ ہے دیکھئے۔ قاسمی، ہاجرہ، کرشن چندر، ہندرناتھ اور ممتاز حسین بہت پیش پیش ہیں۔ احمد عباس نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن اُنھوں نے اس ادب سے براہ راست نفسیاتی چیزیں لی ہیں۔ اور اپنی نظروں کو ایک طرف موڑ کر کچھ کام ضرور کر رہے ہیں۔

پنجاب سے مجھے میرے ایک دوست نے لکھا تھا کہ میری آنکھوں نے جو مناظر دیکھے ہیں۔ ان کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ ماننے کو دل چاہتا ہے۔ اس لئے کہ وہ شرمناکی کی اس حد تک پہونچ چکے ہیں جہاں انسان کا تصور کچھ کام نہیں کرتا۔ اس دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو عقل تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی ہے مثال کے طور پر مذہبی معجزوں کو سمجھنے کے لئے کوئی لاجک یا وجہ نہیں بتلائی جاسکتی مگر وہ ظہور میں آئے ہیں۔ زندگی سے بعض اوقات ایسے صدمات پہونچے ہیں جن کے لئے کوئی دلائل پیش نہیں کئے جاسکتے اس طرح ان فسادات کی کوئی متعین حد نہیں ہے۔ ان کے پس منظر میں بہت سی چیزیں کار فرما تھیں جو عام نظروں سے پوشیدہ ہیں۔

چنانچہ پنجاب میں اس شورش کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے لوگ سیاسی حیثیت سے سب کے پیچھے تھے۔ اندھی تقلید پر ایمان رکھتے تھے۔ ہندوستان کا سارا جسم ایک زہریلا مادہ تھا۔ اور یہ صورت ایک آپریشن کی شکل میں رونما ہوئی۔ البتہ نشتر کی کاری ضربیں اُس مقام پر پڑیں جہاں اماس اور سوجن زیادہ تھی۔ اس آپریشن کا اثر جسم ہندوستان کے ہر حصہ پر پڑا۔ کسی پہ کم اور کسی پر زیادہ۔ اب جو لوگ یہ غل مچا رہے ہیں کہ آپریشن غلط ہوا۔ ایسا نہ ہونا چاہئے تھا یا آپریشن کی جگہ غلط تجویز کی گئی۔ یہ اُنکی ذاتی رائے ہو تو ہو لیکن صاحبانِ بصیرت کی رائے نہیں ہوسکتی۔ عام طور پر ان فسادات سے متعلق شکایت کا لہجہ جواہر لال جی۔ گاندھی جی اور محمد علی جناح کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مگر ان کی دوررس نگاہوں نے یہ سب کچھ بہت پہلے سے دیکھ لیا تھا۔ اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی پاکستان اور ہندوستان کی حدیں مقرر کی تھیں۔ ایک انگریز سیاح بیورلی نکلس نے ۱۹۴۳ء میں ہندوستان آکر یہ سب کچھ محسوس کیا تھا۔ اور اس کی کتاب (" Verdict on India " فیصلہ ہندوستان) میں ان تمام باتوں کی تفصیل ملتی ہے۔ گاندھی جی کے قتل عظیم کے بعد جبکہ وہ ایک ہندو کے ہاتھ سے ختم ہوئے اگر اس فساد کو ہندو مسلم لڑائی کا نام دیا جائے تو کس قدر افسوس ناک بات ہے۔ بدقسمتی سے کرشن چندر کے تمام افسانوں کی سرخیاں ہندو مسلم ہیں اور یہی چیز ظاہر کرتی ہے کہ فساد کی بنیادی حقیقت اُن کی نظر سے پوشیدہ تھی۔ وہ ہندوستان میں انسانوں کو مختلف شکل میں نہ دیکھ سکے۔ اس ملک گیر فساد میں انسانوں نے انسانوں کی نگہداشت بھی کی ہے۔ ہندو نے مسلمان کے گھر کی نگرانی کی ہے اور مسلمان نے ہندو کو بچایا ہے۔ بعض حالتوں میں ایک مسلمان نے مسلمان کو مارا ہے۔ ہندو نے ہندو کو، ان تمام مشاہدوں کے بعد کیا اب بھی یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ یہ فساد ہندو مسلم کے درمیان ہوا؟۔

یہ فساد ایک اقتصادی دباؤ کا نتیجہ بھی تھا دوسری جنگ عظیم کے بعد گرانی اس قدر بڑھ گئی کہ اوسط درجہ کا انسان انقلاب کا منتظر نظر آنے لگا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اس لئے کہ جب ملک معاشی حیثیت سے گرتا ہے تو انقلاب ہی اس کی پشت پناہی کرتا ہے۔ موجودہ حالات کے پیش نظر چند مدبروں کا اب بھی یہ خیال ہے کہ ہندوستان مکمل طور پر اس وقت مطمئن ہوگا جب پوری طرح سے مٹ جائے اس لئے کہ خرابیاں اپنی منزلِ مقصود پر پہونچکر اچھائیوں کے قالب میں ڈھل جائیں گی۔ ملکی اصول سے زیادہ یہ ایک بہت بڑا بنیادی اصول ہے کہ اچھائیاں برائیوں کی شکل میں ہمیں ملیں۔ مثال کے طور پر جھوٹ، چوری، فریب اور شراب سرمایہ داروں کی حمایت میں ہے۔ غریبوں کو اس سے بچنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ترغیب ہی نہیں بلکہ اُن کی روک تھام کے لئے قانون بنایا گیا ہے۔ حالانکہ ہر بڑا آدمی۔ لیڈر۔ اور پادری ایک بہت بڑا جھوٹ ہے جس کی ساری زندگی جھوٹ کو سچ بتلانے میں گذری ہے۔ میرا خیال ہے کہ دنیا کے ہر اوسط درجہ کے انسان کو اس قول سے اختلاف ہوگا۔ اس عالمگیر حقیقت کے پیش نظر اگر فسادات کا مطالعہ کیا جائے تو

ادب میں کسی بیش بہا اضافہ کی امید تھی۔ ہمارے ادیب انقلاب کے اصل وجوہ۔ تحریکوں کی ابتدا واقعات کے باہمی تعلق اور سوسائٹی کی دن بدن تبدیلیوں کے وجود سے ناواقف نظر آتے ہیں۔ انقلاب کا نام محض غارتگری نہیں ہے۔ انقلاب دراصل اُن اصولو معیاروں اور قدروں کی تبدیلی کا نام ہے جو تاریخی حیثیت سے ضروری ہیں۔ اسی طرح ادب خطبوں، نعروں اور تقریروں کا مجموعہ نہیں ہوسکتا۔

ادب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمارے جذبۂ حِسّ کو متحرک کرے جس میں مقصد کو قاری کے اوپر ڈھیلے کی طرح نہ مارا جائے بلکہ اس کے ذہن اور شعور پر اثر ڈالا جائے۔ ہمارے ادیبوں نے انقلاب کی تباہ کاریوں اور اُس کے تخریبی پہلو پر اس قدر زور دیا ہے کہ ہم اُس سے خوف کھانے لگے ہیں۔ قتل وخون۔ غارتگری۔ بغاوت اور موت کے ایک طوفان کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ظاہر ہے کہ ہر وہ امن پسند جو بربادی اور غارتگری کے اس حامی ادب کا مطالعہ کرے گا کبھی اس کی حمایت کرنے پر تیار نہیں ہوسکتا۔ ادب ایک جماعتی حربہ ہے جس کا مقصد آج کل اجتماعی زندگی کی توسیع وترقی اور اس کی تہذیب وتکمیل میں مدد دینا ہے۔ ادب ان معنوں میں آلۂ نشر واشاعت بھی نہیں جن معنوں میں اخبارات ہیں یا مارکس کا اشتراکی اعلان (Communist Manifesto -) تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو ادبیات میں سب سے پہلے اخباروں کو جگہ دی جاتی۔ اور ان سیاسی تقریروں کو ادبی شہ پاروں میں شمار کیا جاتا جو کسی خاص جماعت یا فرقہ کی حمایت میں آئے دن ہوا کرتی ہیں۔ ادب برائے ادب بھی فی زمانہ کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ دنیائے اسباب ہے یہاں کوئی چیز اپنا سبب آپ نہیں ہوسکتی۔ ادب کا کام زندگی کی نمائندگی کرنا اور اس کو فروغ دینا ہے۔ ہم اس گروہ کی ہاں میں ہاں ملانا نہیں چاہتے جو ادب کو سیاست کی طرح صرف عصری حالات کا آئینہ تصور کرتے ہیں۔

★

بھوپال کا واحد دینی اور اصلاحی

دس روزہ

نشانِ منزل

جس کے تین شمارے شائع ہوکر صرف بھوپال بلکہ بیرونِ بھوپال بھی مقبول ہوچکے ہیں۔ آج کے مسلمانوں کو مستقبل کی تعمیر کے لئے مذہبی نقطۂ نظر سے کیا کچھ کرنا ہے۔ ... سیاسی طاقت کا بول بالا کرنا ہے کیونکر عام معاشی خوشحالی کو دور کرنا ہے۔ اس کے لئے

نشانِ منزل کا مطالعہ ناگزیر ہے!

نشانِ منزل خیری اداروں سے ... بنیادوں پر شائع کیا گیا ہے جس کی ترتیب ... (نمونہ کی کاپی مفت)

فی پرچہ ۲ ، سالانہ ...

مینیجر نشانِ منزل۔ بھوپال پریس بھوپال

مشرقی خواتین کا مشہور ماہنامہ

حریم

دسترخوان نمبر

۱۵ جنوری سنہ ۴۹ء کو شائع ہورہا ہے۔ اس خاص نمبر میں ہر قسم کے کھانے پکانے کی ترکیبیں، مٹھائیاں، اچار، مربے ... بنانے کے گُر درج کئے جائیں گے۔ ... یہ بہترین تحفہ ہوگا۔ اس نمبر کو حاصل کرلینے کے بعد ... کسی کتاب کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ دسترخوان نمبر کی قیمت دو روپے ہوگی۔ لیکن حریم کے سالانہ خریداروں کو یہ نمبر بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔ چندہ سالانہ مع رجسٹری دسترخوان نمبر پانچ روپیہ پانچ آنے۔

ملنے کا پتہ

دفتر رسالہ "حریم" ماہانہ لکھنؤ۔

این ۔ سی ۔ مہتہ

ہندوستانی فنونِ لطیفہ پر ایک نظر!

موہنجو دیرو اور ہرپا ـــــ میں فنون لطیفہ کا عروج غالباً مصری تہذیب کا ہم عصر ہے۔ بہرحال سنگ جراحت کا ابرقی بارنش مجسمہ ہندوستان کی نسبت مصر و بابل کے تہذیب و تمدن سے زیادہ مماثلت اور قربت رکھتا ہے۔ موہنجو دیرو کے فنون لطیفہ غیر مہذب یا نیم وحشی نہیں ہیں۔ بلکہ وہ تو ایک ترقی یافتہ تمدن کے مظہر ہیں۔ کھدائی کے دوران میں جو چھوٹی چھوٹی چیزیں نکلی ہیں وہ اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ تین ہزار سال قبل مسیح ایک نہایت ہی ترقی یافتہ تمدن کا دور دورہ تھا۔ موہنجو دیرو کے فنون اور ریکشوں کے عظیم الشان مجسموں کے درمیان ہزار دو ہزار سال کا وقفہ ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ یہ زمانہ فنی تخلیقات سے خالی رہا ہو اس وقت اشوک کے زمانے سے قبل کے کچھ بڑے بڑے مجسمے موجود ہیں۔ لیکن ان مجسموں کو بناتے وقت اظہار جذبات کی جگہ وزن اور جسامت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یہ فن بنیادی طور پر صنعی آفرینی اور زور کی نیابت کرتا ہے۔ اشوک کے زمانہ میں (۲۷۲ ۔ سے ۲۳۲ ق ۔ م) ہندوستانی فنون لطیفہ میں یکایک الہام اور نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ زمانہ اشوک کے ستون دھرم میں نیکی کے ہمہ گیر قوانین کی عظمت کے آئینہ دار ہیں۔ یہ یک حجری ستون گول ہیں اور انھیں یہ نظیر آپ دیگئی ہے۔ سر ستون پر مناسب بدھ نشان تراشے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک اشوکی سر ستون نئے ہندوستان کا نشان ہے ایک اور اشوکی سر ستون رام پورہ نور نمائش گاہ کے دروازے پر نصب ہے اور باغ میں دیوی دیوتاؤں کے اجتماع پر مشفقانہ نگاہیں ڈال رہا ہے۔ ہندوستان کے اس ابتدائی فن لطیف میں حقیقت پسندی جلوہ گر ہے۔ لیکن ازمنہ اوّل کے ان فنکاروں نے اسے کسی اخلاقی یا روحانی نقطہ نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا براہ راست زندگی سے تعلق تھا۔ ان میں عیش و عشرت اور رنج و مسرت کا اظہار تھا۔ کیونکہ یہ انسانی زندگی کے لازمی عناصر ہیں۔ اس فن کا آفتاب شبیہ تراشی اور شکل تراشی کی شکل میں طلوع ہوا۔

ملک بھر میں فنون کے مرکز کھل گئے سارناتھ۔ سانچی۔ ٹیکسیلا۔ امراوتی اور متھرا کے مراکز ان میں زیادہ اہم ہیں۔ سانچی کا ستوپ جو قریب قریب نسائیت کا مظہر اتم ہے، اب بھی اپنے حسنِ قدیم کی جلوہ گری کر رہا ہے۔ سانچی کی دیواروں پر مہاتما بدھ کی زندگی کی حیات کے واقعات منقش ہیں۔ یہ دقائق کشی سیدھے اور دل آویز طریقہ پر کی گئی ہے۔ ستوپ جو حقیقت میں آخر منزل کا مقام تھا مہاتما بدھ کی زندگی کے آخری دور یعنی پر نروان کا نشان بن گیا۔ بدھ کی جتک کہانیاں تصویر سنگ اور نقش حجر کا بہت زیادہ مواد بہم پہنچاتی ہیں۔ سانچی اور امراوتی میں اس فن کی ترقی کی مثال اور معیاری خصوصیات نمایاں ہیں جیسے ٹیکسیلا کی باقاعدگی۔ خطوط پر استادانہ مہارت حیوانی زندگی کی کامل واقفیت اور اعضار نسوانی میں پر شوق رغبت اس زمانہ کی خصوصیات ہیں۔ ہندوستان میں فنون لطیفہ زندگی کا ایک لازمی جزو ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مجسمہ سازوں کی یادیں چٹانوں کو کاٹ کر مندر تراشے جاتے تھے۔

ہندوستان کی سرحدوں پر بھی بدھ اثر نظر آتا ہے۔ یونانی تہذیب کے مقلدین کے دل میں بدھ کے مجسمہ بنانے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن یہ فن کاری ہندوستانی فنون کی تاریخ ہی نہیں بلکہ مہاتما بدھ سے ان کی عقیدت کی آئینہ دار ہے۔ متھرا کی سرگرمی عروج پر تھی۔ اسکا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا اور شمال اور جنوب میں دور دور یہاں کے مقدس مجسمے جاتے تھے اور ادھر دکن میں آندھرا کا قوی اور پرزور دبستان بھی مصروف عمل تھا دور مسیحی کی ان ابتدائی صدیوں میں بھی کشن زمانے کے فنکاروں نے ہند کی دیوی کو زرخیزی کا نقیب بنا کر

پیش کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مادّی چیزوں میں حُسن و مسرت فراوانی سے ملتی تھی۔ مہاتما بدھ کی یہ تعلیم کہ دنیا بے ثبات، اور سریع الزوال ہے ایک بلا شبہ حقیقت کے طور پر مان لی گئی۔ لیکن اِس نقطۂ حقیقت کو روزمرہ زندگی میں اثر انداز نہیں ہونے دیا گیا۔ زندگی کے بارے میں جو یہ مادّی خیال قائم کیا گیا تھا اس میں بدھ مت کے زوال اور گپت راجاؤں کی زیرِ سرپرستی پرانی روایات کی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ساتھ نرمی پیدا ہوتی چلی گئی۔ مجسمہ سازی اور مصوری میں اداسی اور قنوطیت پیدا ہوگئی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ المیہ کی زندگی کا احساس تیز ہوگیا ہے۔ اجنتا کے نقوش دراصل تقریباً سات سو سال کی یادگار ہیں اس فن کی تاریخ ارتقا کا صحیفہ یہ غار دراصل فن تعمیر کا ایک مکمل نمونہ ہیں۔ برکھا کی رت میں بدھ بھکشوؤں کے لئے یہ غار مقامِ امن کا کام کرتے تھے۔ صدیوں کی تقدیس، عقیدت اور عبودیت نے ان خانقاہوں کو انمول دولت بخشی ان غاروں کے نقوش، تصویریں اگرچہ نقطۂ نگاہ سے بدھ ہیں۔ لیکن ان میں زندگی کا ہر پہلو ایسے جذبات اور مہارت سے دکھایا گیا ہے کہ اس کی نظیر پیش کرنا قریباً ناممکن ہے۔ ہندوستان کے سارے فنون لطیفہ میں ایک نفسیاتی اور جسمانی امتزاج پایا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ قول کالی داس مکتی جسمانی صحت کے بغیر ناممکن ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو مشرق بعید اور ان ممالک کے فنون میں جو ہندوستان کے زیرِ اثر تھے جلوہ گر ہوئی۔

اجنتا کی تکمیل کے بعد بھی ہندوستانی فنون لطیفہ کا آفتاب نصف النہار پر نہیں پہنچا تھا۔ اس کے بعد مہابلی پورم کے ساحلی مندر الیفنٹا کے غیر معمولی غار اور ایلورا کے شاہکار وجود میں آئے۔ نویں اور دسویں صدی کے الیفنٹا کے غار اس فن کے اس دور کے آئینہ دار ہیں جس میں ہندوستان کے فنون لطیفہ صفت خداوندی میں رنگے ہوئے تھے۔

ہر چیز شاندار اور ہر تصویر عظیم المرتبت نظر آتی ہے۔ تعمیر مندر کے اس دور کے بعد ہندوستان میں اور خاص طور پر اڑیسہ، کھجوراہو، اور وسط ہند میں یہ فنون جذبات اور عشرت پسندی کے طوفان کا ایک غیر معمولی نقش بن گئے۔ لیکن چودھویں صدی کے آخر تک شمالی ہند میں خاص طور پر تخلیقی جذبہ ختم ہوچکا تھا۔ تاہم دکن میں سیو کے کانس کے مجسمے میں اور خاص طور پر نٹراج سندر مورتی سوامی وغیرہ کے مجسموں میں یہ تخلیقی قوت سترھویں صدی تک ظاہر ہوتی رہی۔

روایتی تسلسل، جدت، اختراع، اور تخلیق ہندوستانی آرٹ کی خصوصیات ہیں۔ زندگی اور مذہب کے بنیادی تصورات کو جس اختراعی قوت سے ہندوستانی آرٹ ڈھالتا ہے۔ وہ ہندوستان کا ہی حصّہ ہے۔ مثال کے طور پر شلو کو نٹ راج کی شکل میں پیش کر کے متوازن حرکت کی بہترین شکل پیش کی گئی ہے۔ یا پھر مہاتما بدھ کے مجسمے پر نظر ڈالئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف خود سکون حاصل کر چکے ہیں بلکہ ان کے چاروں طرف ہر ذی حس شے میں سکون اور اطمینان کا نفوذ ہو رہا ہے اور پھر عقیدتمندی کی تصویر مجسّم سندر مورتی سوامی کو دیکھئے۔ آسمانی دوشیزائیں۔ اپسرائیں ویویکش غرضکہ آسمانی آبادی کی ہر ایک اجنبی اور بوقلموں شکل لوگوں کے سامنے پیش کر دیگئی۔ نسوانی جسم کی تشکیل ہندوستانی آرٹ کے ابتدائی دور میں ڈھالی گئی اور انیسویں صدی تک ہندوستانی فن کاروں کے دل میں ولولہ اور جوش پیدا کرتی رہی۔ عورت کا یہ تصوّر ایک جوان اور سندر اور چھریرے بدن میں ظاہر ہوا تھا۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ سب شکلیں تخیل کی مرہون منّت ہیں۔ فن کار مجسمہ ساز نے اپنے چمنستانِ تخیّل کو اصل زندگی کی پھلواری سے آلودہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یوں سمجھئے کہ اس نے مندروں میں انتہائی پاکیزگی معصومیت اور انکساری کے ساتھ ان مجسموں کو تراشا ہے۔ تعمیر کے بعد وہ مستقبل کی ہمہ گیر ملکیت بن گئے تاکہ آنے والی نسلیں اُپاسنا کے پھولوں سے خراج عقیدت پیش کریں۔ مجسمہ تراش اور مصوّر دونوں کو رقاص سے ایک خاص تعلق رہا ہے۔ کیونکہ ان دونوں کا موضوع رقاص کی وہ ادا ہوتی ہے جو پلک جھپکنے میں وجود سے عدم کی دنیا میں چلی جاتی ہے۔ کانگڑہ، چترکار، میں خطوں کی روانی سرعت اور بہار کی خصوصیات کے لئے مشہور ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اجنتا کے فن کاروں کے زوال کے ساتھ مصوّر کا فن بھی انحطاط پذیر ہوتا گیا۔ گیارھویں صدی سے پندرھویں صدی تک مصوّر کا فن چھوٹی چھوٹی تصویریں سے اور کتابوں کو مصوّر کرنے تک محدود ہوگیا تھا۔ دیواروں پر کی

چترکاری ہوتی رہی لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس وقت اس فن کا کیا درجہ تھا۔ مغلوں کی آمد کے ساتھ تصویر کشی کے فن میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ لیکن زندگی بڑی مختصر تھی۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں نے اس فن کو اپنی سرپرستی سے نوازا۔ لیکن یہ فن شخصیتوں اور دربار کے واقعات سے متعلق تھا تاہم صوبہ داروں کے درباری چترکار۔ برابر رسمی اور تقلیدی فن میں مصروف رہے۔ تیرھویں صدی کے آواخر تک مغل آرٹ میں حسن مذاق اور تکنیک کا انحطاط ہو رہا تھا۔

اٹھارویں صدی کے ربع اوّل میں بشولی کے چترکار گجرات اور راجپوتانہ سے مستعار حیات لے کر انھیں دل کش رنگوں سے اجاگر کر رہے تھے۔ راوی سے ستلج تک مختلف ٹھکانوں میں اور مغربی ہمالیہ میں ریاست ٹیھری گڑھوال تک فن تصویر کشی کے مرکز قائم ہو گئے۔ مغل دربار کی سرپرستی جوں جوں کم ہوتی گئی مصوّر پہاڑی راجاؤں کے درباروں میں باریابی حاصل کرتے گئے۔ سنسکرت اور ہندی کی ہزاروں کہانیاں، واقعات اور داستانیں مصوّر کے قلم سے منصۂ شہود پر آ گئیں۔ محلوں کی وسیع دیواریں تصویروں سے آراستہ ہو گئیں۔ ان میں سے بہت سی تصویریں اب تک محفوظ ہیں اور خاص کر چمبہ۔ منڈی۔ تیرہ سوجان پور ناہن اور دوسری جگہوں میں پائی جاتی ہیں۔ کانگڑہ آرٹ نے مغل دربار کی کل خوبیوں کو اپنا لیا۔ لیکن یہ ——— آرٹ شریمد بھاگوت اور گیتا گوبند کی غزل اور جذبات کی دنیا میں زیادہ زیب دیتا ہے۔ چنانچہ ان تصویروں میں جذبات اور نغمگی کا ایسا امتزاج ہے جو مغل آرٹ کی پابندی اور باقاعدگی میں بالکل مفقود ہے۔ راجپوتانہ کے بہت سے ٹھکانوں اور خاص کر بیکانیر، جے پور، جودھپور، دنیا اور اُرچھا درباروں کے فن کار خاص طور پر سرگرم تھے انیسویں صدی کے آخر میں یہ مرکز بھی زوال کی نذر ہو گئے۔ ہمالیہ کی ریاستیں سکھوں کی بڑھتی ہوئی طغیانی میں بہ گئیں۔ مرہٹوں کی طرح سکھوں نے فن لطیف کا کوئی خاص نمونہ نہیں چھوڑا۔ انیسویں صدی کے وسط تک ہندوستانی آرٹ کی تخلیقی قوت ختم ہو چکی تھی لیکن نصف صدی کی خاموشی کے بعد ہندوستانی فنکار کو اپنا بھولا ہوا آدرش یاد آ گیا۔ پانچ ہزار سال سے زائد زمانہ تک ہندوستان نے دنیا کے فنون لطیفہ کو جو دولت بخشی ہے، اب نیا ہندوستان اس میں اضافہ کرنے میں ہیٹا نہیں رہے گا۔

(بقیہ جہانِ تازہ) فن کے اس مرکز پر ماضی، حال و مستقبل سمٹ آتے ہیں اور آس و یاس کی حدیں مل جاتی ہیں۔ اب انسانی ذہن اپنی آرزوؤں کے تیار کردہ رنگ محل کے دریچوں سے اپنی بلندی کا جائزہ لے سکتا ہے۔ دراصل انسانی ذہن کی گہرائیوں میں اس کی ازلی بلندی کا نغمہ چھپا ہوا ہے۔ جو تخلیق کی مضراب سے جاگ اٹھتا ہے۔ اس متلاطم آواز کو سن کر انسان جیسے چونک جاتا ہے لیکن یہ صدائے دل نشیں کسی منزل گم شدہ یا کسی انجانی راہ کا پتہ نہیں دیتی۔ بلکہ ماحول کی پستیوں میں انسان کو اس کے بلند مقام سے آگاہ کرتی ہے۔ اسی لئے احساسات انسانی کے پروردہ اس خواب میں جسے فن کہتے ہیں، تاروں کی چھاؤں میں جنم لینے والے سپنوں کی خوشگواری بھی ہے اور نوید سحر بھی۔

کاش آرٹ کے پردے میں سیاسی نظریوں کے مبلغ زندگی کی ابدی قدروں کو سمجھ سکیں۔

نئی کتابیں

زعفران کے پھول (خواجہ احمد عباس) ۶/۱۲ — ایک گرجا ایک خندق (کرشن چندر) ۳/-
چغد (منٹو) ۲/- — ۱۹۴۷ء کا بہترین ادب (مکتبۂ اردو) ۶/-
ناروا (فرقت) ۶/- — ہندوستانی لسانیات کا خاکہ (احتشام حسین) ۶/-
(فہرست کتب مفت طلب فرمائیے) ملنے کا پتہ:- کتابی دنیا، نظیر آباد۔ لکھنؤ۔

فلمستان

"ہلچل" کا تنازعہ

افکار کے ان ہی صفحات میں اس سے قبل انڈیا فلم کارپوریشن لمیٹڈ بھوپال کے زیر تکمیل فلم "ہلچل" کے نام کی چوری کے متعلق خبر شائع ہو چکی ہے۔ اسی سلسلہ میں تازہ ترین اطلاع یہ موصول ہوئی ہے کہ پروڈیوسر آصف کسی وکیل کا سہارا لیکر نام تبدیل کرنے کے بجائے قانون کی لفظی پناہ لینے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ انھوں نے انڈیا فلم کارپوریشن کو لکھا ہے کہ آپ کا فلم Hal-Chal ہے اور ہمارا Hul-Chul ـــــ جس کی تصحیح آئندہ اشتہارات میں کر دی گئی ہے۔ چنانچہ فلم انڈیا کے تازہ پرچہ میں لفظی ترمیم اسی H**l-Ch**l کی صورت میں کی گئی ہے۔ ہندی اور اردو میں بدستور "ہلچل" چھپ رہا ہے۔

اسی سلسلہ کی دوسری دلچسپ خبر یہ ہے کہ انڈیا فلم کارپوریشن لمیٹڈ، جو "ہلچل" کا اعلان تقریباً ایک سال قبل کر چکی ہے اور جس کے مصنف بھوپال کے سابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تربینی سرن شاد ہیں۔ نیشنل تھیٹرس کے پروڈیوسر آصف اور اُن کے اعلان کردہ فلم "ہلچل" کے غیر آئینی اعلان کے خلاف قانونی کارروائی کرنیوالی ہے جس کی پیروی خود مصنف کریں گے۔ دنیائے فلم میں نام کے تنازعہ کا یہ مقدمہ یقیناً ایک انوکھا مقدمہ ہوگا۔

علوی

بھوپال کا باہمت نوجوان علوی جس نے "مہاتما گاندھی کا پیغام" میں نمایاں کام کیا ہے اب ایورسٹ فلم کارپوریشن کے ایگزیکیٹو پروڈیوسر کی حیثیت سے "امر بھینٹ" تیار کر رہا ہے۔ امر بھینٹ ایک نفسیاتی پیشکش ہے۔ جس کی کہانی حشری اور بھگوتی پرشاد نے لکھی ہے۔ اس فلم میں علوی کے علاوہ **ثریا**، چودھری، پریم کانت، لیلا مصرا، این کے مصرا، آر تیواری، بیگم اور حلیم کام کر رہے ہیں۔ ہدایت کاری کے فرائض حشری انجام دیرہے ہیں اور گانے شکیل بدایونی، صہبا لکھنوی، جہاں قدر چغتائی اور کیف بھوپالی لکھ رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ فلم گوناگوں خصوصیات کی حامل ہوگی۔

نیو شان ہند کا بنجارہ

رئیس کے مشہور ڈائرکٹر قیصر صہبائی کا دوسرا شاہکار "بنجارہ" جس کے پروڈیوسر موہن کمار ہیں تکمیل کے ابتدائی مراحل طے کر رہا ہے۔ بنجارہ کی کہانی ایم شفیع امروہوی نے لکھی ہے اور مکالمے کامدار الدنی اور وزیر حسن دہلوی کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ اسکرین پلے اقبال مرزاپوری نے تحریر کیا ہے اور گانے ساغر بدایونی، شمس صدیقی اور محشر امروہوی نے لکھے ہیں۔ بنجارہ کی کاسٹ میں یعقوب، شانتا کنور، رنجنا دیوی، الطاف موہن کمار اور رمیش اردرہ، انوری بائی، حسن پہاڑی، ابوبکر اور نئی دریافت ہے، لتا۔ شامل ہیں۔

موضوع کے لحاظ سے بنجارہ ـــــ "سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلے گا بنجارہ" کے حسین دمرمریں تخئیل کا آئینہ دار ہوگا۔ جسے ڈائرکٹر قیصر صہبائی قدیم و جدید رنگ تخئیل کی لطیف آمیزش سے سلولائڈ میں منتقل کر رہے ہیں۔

پیسے والے

یہ خبر نہایت مسرت سے سنی جائیگی کہ شری آر کے کھنی بی اے، ایل ایل بی نے بیکو آرٹ پکچرز نامی فلمی ادارہ قائم کیا ہے۔ ان کی پہلی سوشل پکچر کا نام "پیسے والے" تجویز کیا گیا ہے۔

اسٹوری، گانے اور ڈائریکشن کا کام بیکل امرتسری انجام دیرہے ہیں۔ جو کہ فلمی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں میوزک کے لئے مسٹر سیٹھ ریڈیو آرٹسٹ اور ہیرو کے لئے کھتری پال کا نام لیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ رام لال (شوری پکچرز فیم) اور اندو کماری خاص اداکار ہیں۔



علوی

بھوپال کا ایک ہونہار نوجوان جو پہلی بار ''مہاتما گاندھی کا پیغام''
میں نمایاں ہورہا ہے۔



دامن کوہسار کا ایک منظر

PRINTED AT GOVT. PRESS. BHOPAL.